منظر ایوبی

منظر ایوبی کی شاعری میں موضوع و مواد کا بڑا تنوع ہے۔ اس انداز کا تنوع صرف اُس شاعر کے ہاں ملے گا جو زندگی سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو اور جسکی نگاہ اتنی وسیع و عریض دنیا میں کسی ایک نقطے پر جم کر نہ رہ گئی ہو۔ اس تنوع میں بڑی توانائی، رعنائی اور تازگی ہوتی ہے۔ دُکھ تو ہماری معیشت اور معاشرت کی دین ہیں اور شاعر کو ویسے بھی ان دُکھوں میں سے حصہ وافر ملتا ہے مگر منظر ایوبی کو یہ دُکھ ریزہ ریزہ نہیں کر ڈالتے، بلکہ اسے تن کر کھڑا ہونے، اور اپنی بے بضاعتی کے باوجود، نبرد آزما رہنے کی جرأت اور استقامت بخشتے ہیں۔ اس طرح کی استقامت منظر کے اس اعتماد سے پیدا ہوتی ہے کہ آخری فتح بہرحال انسان کی اور زندگی کی اور زمین کی قوتِ نمو کی ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ منظر کے ہاں اپنے ہی اندر اُتر جانے اور اپنی ہی ذات کو کھوجتے رہنے کی کیفیت کم کم ملتی ہے۔ منظر ذات کی بجائے اجتماع کا شاعر ہے اور اسی لئے اس کے ہاں حیرت انگیز گوناگونی اور بلا کی رنگا رنگی ہے۔

(احمد ندیم قاسمی)

منظر کی فکر کی دیانت، مدرکات کی گیرائی اور لہجے کی تہذیب و توانائی ان کے تشخص اور تفرد دونوں کی ضمانت دار ہے۔ ان کے فن کی جڑیں اس حقیقت کے سینے میں بڑی گہری چلی گئی ہیں جس کا نام ماضی ہے اور اسی فن کی شاخوں کا دوسرا نام منظر ایوبی کے فن کا وہ سارا تخلیقی سرمایہ ہے جس کو خود شاعر نے تکلم کا بصیرت افروز نام دیا ہے۔ ان شاخوں کے پھولوں میں صرف حال ہی کی خوشبو نہیں آتی بلکہ ایک آنے والے دَور کی مہک بھی برابر محسوس ہوتی ہے۔

(پروفیسر منظور حسین شور)

منظر ایوبی نظم و غزل پر یکساں قدرت رکھتا ہے۔ وہ مثبت رجحانات اور نظریات کا شاعر ہے۔ غزل میں زندگی کے ایسے تجربات کو اس نے جگہ دی ہے جو ہماری موجودہ زندگی کی تلخیوں، محرومیوں، امیدوں، حسرتوں اور غموں کے آئینہ دار ہیں۔ وہ صرف عشق کا شاعر نہ پہلے تھا نہ اب ہے بلکہ اپنے عہد سے قریب ہو کر شعر کہتا رہا ہے اس اعتبار سے اس کی غزل میں کیفیات و تاثرات کی بڑی رنگا رنگی ہے۔

(پروفیسر انجم اعظمی)

تکلّم

(غزلیں)

منظر ایوّبی

شاداب اکادمی

کراچی ۳۳

مرتب	حجاب منظر
سرورق	عاتکہ بشیر
کتابت	سیّد اسحاق
نگراں طباعت	رباب منظر، شکیل احمد غوری
مطبع	مشہور آفسٹ پریس کراچی
طبع اوّل	ایک ہزار
اشاعت	۱۹۸۱ء
ناشر	شہاب منظر

قیمت ۲۵ روپے

زیرِ اہتمام

شاداب اکادمی

اے-۳۹۴- بلاک "آئی" نارتھ ناظم آباد (تیموریہ)

کراچی ۳۳

پیاری امّی

حمیدہ بانو (مرحومہ)

پیارے ابّا

علی احمد ایّوبی (مرحوم)

(جن کی شفقت اور سایۂ عاطفت سے میں کم سنی ہی میں محروم ہو گیا تھا)

اور

شفیق استاد **ڈاکٹر ابواللّیث صدیقی**

کے نام

منظر ایّوبی

ترتیب

۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۹ء

۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۷ء

منظرؔ ایوبی

بنامِ منظر ایوبی

تغزل کیا ہے؟ فکرِ نیک نامِ منظر ایوبی ۔۔۔ تکلم کیا ہے؟ اندازِ کلامِ منظر ایوبی

میں ان کو میر و غالب تو نہیں کہتا مگر پھر بھی ۔۔۔ مرے دل سے کوئی پوچھے مقامِ منظر ایوبی

میں ناقد تو نہیں لیکن "تکلم" کی اشاعت پر ۔۔۔ مبارکباد دیتا ہوں بنامِ منظر ایوبی

روایت چھوڑنے کا چونکہ قائل ہی نہیں ہے وہ ۔۔۔ روایت کر رہی ہے احترامِ منظر ایوبی

رہے قائم توازن رجعت و جدت پسندی میں ۔۔۔ بنامِ فن یہی ہے اہتمامِ منظر ایوبی

خود اپنی آگ میں جل کر دلوں کو روشنی دینا ۔۔۔ اگر کچھ ہے تو بس یہ ہے پیامِ منظر ایوبی

یہ مانا ان کا ساغر ہے وہی جامِ کہن لیکن ۔۔۔ شرابِ نو سے ہے لبریز جامِ منظر ایوبی

سرور و کیف پر وہ پیاس کو ترجیح دیتا ہے ۔۔۔ سبب اس کا ہے ذوقِ تشنہ کامِ منظر ایوبی

مورخ اب نظرانداز کر سکتا نہیں ان کو ۔۔۔ کہ لوحِ وقت پر لکھا ہے نامِ منظر ایوبی

فگارؔ الفاظ و معنی اُس سے بچ کر جا نہیں سکتے
فضا میں ہر طرف پھیلا ہے دامِ منظر ایوبی

(دلاور فگار)

مُتکلّم

میں اب تک وقت کا محتسب رہا ہوں لیکن "متکلّم" کی اشاعت نے مجھے وقت کے حوالے کر دیا ہے۔ آج میں وقت کی عدالت میں کھڑا ہوں، چاہوں بھی تو احتساب سے نہیں بچ سکتا۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ وقت کا فیصلہ صادر ہونے سے قبل وہ سب کچھ بتا دوں جس کا میری ذات اور میرے فن سے بلاواسطہ یا بالواسطہ تعلق ہے۔

میں نے یکم ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ مطابق ۴/اگست ۱۹۳۲ء کو بدایوں (روہیلکھنڈ) یو پی (بھارت) کے ایک زمیندار گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ عام قاعدے کے مطابق پہلے دینی مکتب میں مذہبی تعلیم حاصل کی۔ عربی و فارسی کی شُدبُد ہونے کے بعد انگریزی کی مروّجہ ثانوی و اعلیٰ ثانوی درسگاہ (اسلامیہ اسکول و کالج) سے بالترتیب میٹرک اور انٹر کامرس کے امتحانات پاس کئے، باقی بی۔کام اور ایم۔اے کی ڈگریاں ۴۷ء کی آزادی کے بعد جامعہ کراچی سے حاصل کیں۔

یو پی کے مُسلمانوں کی اکثریت زمیندار گھرانوں پر مشتمل تھی۔ معدودے چند کے سوا ہر زمیندار خاندان، زندگی کی چند اجتماعی قدروں کا حامل تھا۔ میرے ذہن کی ابتدائی نشوونما بھی نیم مذہبی و نیم ادبی ماحول میں ہوئی۔ صوم و صلوٰۃ کے اس نیم مذہبی گھرانے میں، ایک طرف میں نے خدا اور رسول کے احکامات کی باقاعدہ تعمیل ہوتے دیکھی تو دوسری طرف ان رسموں اور طور طریقوں کا نفاذ بھی دیکھا جو جاگیردارانہ طرزِ معاشرت کے آئینہ دار تھے۔ زمیندار اور جاگیردار بغیر تخصیصِ مذہب و ملّت

ایک ہی کردار کے حامل تھے۔ وہ اپنی مخصوص سلطنت کے بے تاج بادشاہ تھے، کاشتکاروں کے ساتھ تقریباً ان سب کا سلوک یکساں تھا۔ رعایا ننگی ہو یا بھوکی، لگان وصول کرنا، ان کا فرضِ منصبی تھا کئی نسلوں سے چونکہ میرے خاندان میں زمینداری کے ساتھ ساتھ خود کاشت کا طریقہ بھی رائج تھا۔ اس لئے مجھے اپنے لڑکپن میں اس طبقاتی کشمکش اور معاشرتی تضاد کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ابتدائی عمر کے ان تجربوں اور مشاہدوں سے میری آئندہ زندگی پر بڑے دُور رس اثرات مرتب ہوئے۔ میرے دل میں کاشتکاروں کے لئے رحم کا جذبہ پروان چڑھنے لگا اور وہ طبقہ مجھے نہایت معصوم، مظلوم اور محکوم نظر آنے لگا تھا۔ آئندہ چل کر میری سوچ اور فکر کی جو ایک خاص سمت متعین ہوئی اس کے دراصل یہی اسباب وعلل تھے کہ آبا واجداد جاگیردار بھی تھے اور کاشتکار بھی۔

یہاں یہ امر بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ عام روش کے مطابق والدین نے مجھے اس غرض کے لئے چُن لیا تھا کہ میں ان روایتوں کا محافظ رہوں گا جو بطور ورثہ میرے حصے میں آئیں گی، لیکن میرے بخت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ زندگی میں ایک وقت ایسا آیا کہ میں بھی اس زمینداری نظام کا ایک کارندہ بننے پر مجبور تھا لیکن حالات نے مجھے بچا لیا۔

میرا آبائی گھرانہ شہر اور گاؤں دونوں حویلیوں میں بٹا ہوا تھا۔ فصلوں کی بوائی، کٹائی اور زمینوں کا لگان وصول کرنے کے دوران والدین بہن بھائی سب گاؤں کی حویلی میں قیام کرتے اور سال کے باقی حصّوں میں شہر کی حویلی میں۔ اس تفصیل کا مقصد آبائی شان وشوکت کا اظہار ہرگز نہیں ہے، چونکہ اسی مدّت کے دوران کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جن کے ذکر کے بغیر میرا اب تک کا خاکۂ حیات نامکمل رہے گا۔ لہٰذا اُن نکات پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

مجھ پر پہلا جانکاہ سانحہ اس وقت گذرا جب میرے والد ماجد جناب علی احمد ایوبی جواں عمری میں داغِ مفارقت دے گئے۔ اس وقت میری عمر تقریباً دس سال تھی۔ نظامِ زمین و کاشتکاری کا تمام تر بار والدہ ماجدہ (حمیدہ بانو) کے شانوں پر پڑ گیا، پھر اس کے بعد آزمائش و ابتلا کا ایک ایسا روح فرسا دَور آیا جس کے تصور سے میں آج بھی کانپ اُٹھتا ہوں۔ والد کی رحلت کے بعد "زر اور زمین" کے خاندانی تنازعات سے زندگی چند برس تک اجیرن بنی رہی۔ وقفہ وقفہ سے ۱۱ افراد پر مشتمل خاندان گھٹ کر صرف دو بھائی اور ایک بہن کی صورت میں باقی رہ گیا۔

دوسرا حادثہ ۱۹۴۷ء کی آزادی کے فوری بعد پیش آیا۔ نقلِ آبادی کے نتیجے میں پاکستان سے غیر مسلموں کا جو ریلا بھارت میں داخل ہوا، اس سے بدایوں شہر اور اس کے مضافات بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ آلاتِ کاشتکاری اور رہائشی ساز و سامان سے بھری دیہی حویلی ایک غیر مسلم شرنارتھی کی نذر ہوگئی۔ دلوں میں نفرتوں کی خلیج اتنی گہری ہو چکی تھی کہ مسندِ عدالت پر جلوہ افروز حضرات بھی حق و صداقت کا ساتھ نہ دے سکے۔ بچے کھچے سرمائے سے زندگی گزارنی مشکل ہوگئی تو باقی جائداد کا تحفّظ جس جس کے حوالے کر کے ۱۹۵۰ء میں مَیں ہجرت کر کے پاکستان آگیا۔

کراچی پہنچ کر اطمینان کا سانس ضرور لیا مگر ہجرت سے جو توقعات میں نے وابستہ کی تھیں ان کے پورا ہونے میں خود میرا مزاج آڑے آتا رہا۔ میں کسی عزیز یا رشتہ دار کو ذریعہ بنائے بغیر زندگی کا نیا سفر شروع کرنا چاہتا تھا جب کہ یہاں کی رِیت ہی کچھ اور تھی۔ سفید پوشی کا بھرم قائم رکھنے کے لئے میں مجبوراً مرکزی وزارتِ محنت میں ملازم ہوگیا۔ گھریلو ذمّہ داریوں میں اضافہ اور سر چھپانے کے لئے موزوں جگہ کی ضرورت محسوس ہوئی تو مجھے خوب سے خوب تر کی تلاش میں نکلنا پڑا۔ ترکِ وطن کی وجہ سے سلسلۂ تعلیم منقطع ہو چکا تھا لہٰذا ملازمت کے دوران اس کو بھی جاری رکھنا پڑا۔ وہ بڑا صبر آزما دَور

تھا مگر رفقائے کار کے تعاون سے پنجاب یونیورسٹی سے اُردو آنرز اور جامعہ کراچی سے بی۔کام اور ایم۔اے کی ڈگریوں کا حصول آخر کار ممکن ہوا۔ اس طرح شب و روز کی محنت کا ثمر دفتری ملازمت کے انقطاع اور شعبۂ درس و تدریس سے وابستگی کی صورت میں ملا۔ یہ پیشہ چونکہ مزاج کے عین مطابق تھا اس لئے خوشگوار زندگی اور ترقی کا ضامن ہوا۔ بہ فضلِ ربّی اب تک اسی شعبے سے منسلک ہوں۔

خدا کا شکر ہے کہ زندگی کی تگ و دَو میں مجھ سے اب تک کوئی ایسا فعل سرزد نہیں ہوا جو میرے آبا کے وقار کو مجروح کرتا۔ مجھے اپنی اس انا پر فخر ہے۔ البتہ میں اس امر کا اعتراف ضرور کروں گا کہ زندگی میں بعض سنہری مواقع میں نے ضائع کئے ہیں اور اس زیاں میں میرے اندر کا وہ "جاگیردار" برابر کا شریک رہا ہے جو بعض نازک اوقات میں جاگ اُٹھتا ہے، اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ کبھی کبھار میں اپنی اس نفسیاتی کمزوری پر پشیمان ہوتا ہوں مگر بے سود۔

زندگی کے جن واقعات کی نشاندہی سطورِ بالا میں کی گئی ہے وہ میرے فکری ارتقاء کی تفہیم کے لئے کلیدی حیثیت کی حامل ضرور ہے مگر اس کے علاوہ میری شاعرانہ شخصیت اور فن کے تعین کے لئے کچھ اور مواد بھی احاطۂ تحریر میں لانا ضروری ہے۔

بدایوں مسکنِ اولیا ہی نہیں، گہوارۂ علم و ادب بھی ہے۔ اس خاک سے عظیم ادبی، علمی اور مذہبی شخصیتوں نے جنم لیا ہے۔ بعض شخصیتیں عالمگیر شہرت کی حامل ہیں اور بعض اپنی تبحرِ علمی کی وجہ سے آج بھی محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ بدایوں کے اُس علمی و ادبی ماحول میں ۱۹۴۷ء سے میں نے شعر گوئی کا آغاز کیا، جہاں گھر گھر شعر و شاعری، کوچہ کوچہ بیت بازی اور قریہ قریہ علمی و ادبی مجالس منعقد ہوتی تھیں۔ میں جب دنیا میں آیا تو کانوں میں پہلی آواز تو اذان کی پڑی تھی اور دوسری

" فاعلاتن فاعلاتن فاعلات" کی۔ ایسی فضا میں موزوں طبع رکھنے والا شخص شعر گوئی پر فطرتاً راغب ہو جاتا ہے۔ میں نے مشقِ سخن شروع کی تو شہر میں کئی اساتذہ مسندِ شاعری کی زینت بنے ہوئے تھے۔ ان سب کی سرپرستی اور تعاون مجھے حاصل رہا۔ خاص طور پر میرے حقیقی ماموں علامہ عارف ایوبی (بھارت کے مشہور و معروف شاعر) نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی۔ وقت بہت گزر چکا ہے۔ آج، اُس عہد میں کہی گئی غزلیں عجیب سی لگتی ہیں مگر میں انھیں نظر انداز نہیں کر سکتا کیونکہ وہ میری شعری تاریخ کا ایک حصہ ہیں اور اس ادبی ماحول کی آئینہ دار ہیں جس پر شعر و ادب کی جدید تحریکوں کا مطلق اثر نہ تھا، البتہ ۱۹۵۰ء کے بعد پاکستان میں کہی جانے والی غزلوں اور نظموں میں آپ کو اپنا عہد، اپنی زندگی کی تمام سچائیاں، رعنائیاں اور تلخیاں بھرپور تاریخی پس منظر کے ساتھ نظر آئیں گی۔ اس مدت میں جہاں دنیا میں کئی انقلابات آئے وہاں پاکستانی قوم بھی کئی بار امتحان و آزمائش سے گذری۔ ذاتی تجربات و مشاہدات، خارجی حالات و واقعات، ادب و شعر کی عالمی تحریکوں، رجحانوں اور نظریوں نے جس طرح جذبہ و فکر پر اپنے اثرات مرتب کئے ان سب کا عکس ۵۰ء کے بعد کی تخلیقات میں موجود ہے۔

میرے نزدیک شاعر کا کمالِ فن صرف وقت کی لَے سے لَے ملانا نہیں بلکہ حیاتِ اجتماعی پر تنقید کرنا بھی ہے۔ وہ عصری تقاضوں کو اسی وقت پورا کر سکتا ہے جب اس کا تاریخی شعور پختہ ہو۔ تاریخی شعور کی روشنی ہی دراصل اسے اپنے عہد کی تاریکیوں سے روشناس کراتی ہے، سماجی ناہمواریوں کا احساس دلاتی ہے اور اسے اپنے بنیادی فرائض کی تکمیل پر اُکساتی ہے۔ سوچ کا یہ انداز شاعر کو مفسّر یا شارح کے درجے سے بلند کر کے اس مقامِ نقد پر فائز کرتا ہے جہاں وہ اپنے عہد کے راگ الاپنے کے ساتھ ساتھ عدل و انصاف اور مساوات پر مبنی

معاشرے کی تشکیل کے لئے اپنا سماجی فرض پُورا کرتا ہے۔ معاشرتی قدروں کے جدلیاتی عمل کا ادراک ہی دراصل فن کی معراج ہے۔

عالمی مفکرین کی یہ متفقہ رائے ہے کہ شاعری انسان کے دل و دماغ کو براہِ راست متاثر کرتی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود اگر کوئی فنکار آلاتِ فن رکھتے ہوئے معاشرے کے رستے ہوئے ناسوروں کا آپریشن نہیں کرتا تو وہ نہ صرف اپنے فرض سے پہلوتہی کرتا ہے بلکہ وہ کارآمد عطیاتِ الٰہی کا اہل بھی نہیں جو قدرت کسی کسی کو نوازتی ہے۔

تمام عمر میں خود بھی تماشہ بنا اور زندگی کا تماشائی بھی رہا۔ کبھی لمحوں نے مجھے اپنی گرفت میں رکھا اور کبھی وقت کی طنابیں میرے ہاتھوں میں رہیں۔ غرض میں نے زندگی کو اپنے مسلکِ فن کی روشنی میں جس طرح دیکھا، پرکھا اور محسوس کیا ہے نہایت دیانتداری کے ساتھ لفظوں کی صورت میں اس کا اظہار کرتا رہا ہوں۔ میرے ان تجربوں میں کتنی صداقت ہے، اور یہ کتنی سچائیوں کا نچوڑ ہیں آنے والی نسلیں اس کا فیصلہ کرسکیں گی اس لئے کہ میرا تمام تر ذہنی سرمایہ انھیں کی وراثت ہے۔ "تکلّم" کی اشاعت کے اس موقع پر میں اپنے ان تمام بزرگ احباب کا تہِ دل سے شکر گذار ہوں جنھوں نے مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ میں اُن ہم عمر دوستوں اور کرم فرما حضرات کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے اشعار کے انتخاب سے لے کر اشاعت کے آخری مرحلے تک عملی تعاون کیا۔

نفسا نفسی کے اس دَور میں گھر کے وہ افراد بھی شکریہ کے مستحق ہوتے ہیں جو علمی اور ادبی امور کی انجام دہی میں ادیب و شاعر کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ میں اپنی رفیقۂ حیات حبیبہ خاتون کی بے لوث محبت، بڑے صاحبزادے شہاب منظر، دو صاحبزادیوں حجاب منظر اور رباب منظر کے بے پناہ خلوص کا ذکر کیوں نہ کروں جن کی بدولت مجھے عروسِ سخن کے گیسو سنوارنے اور چہرۂ غزل کو نکھارنے کی مہلت ملی۔ مجھے اپنے جملہ اہلِ خانہ پر فخر ہے کہ انھوں نے زندگی کے تمام دُکھ اپنے دامن میں سمیٹے اور مسرّت کے پھولوں سے میری

آغوش سجائے رکھی۔ میرے لئے یہ امر کچھ کم خوشی کا باعث نہیں کہ انھوں نے مجھے گھریلو تفکّرات سے دُور رکھا جس کے باعث میں اپنا شعری سفر جاری رکھے ہوئے ہوں۔

اس مجموعے میں شامل بیشتر غزلیں ہند و پاک کے معیاری رسائل و جرائد میں شائع ہو چکی ہیں، کچھ تازہ غزلیں ممکن ہے بعض ذرائع سے اہلِ ذوق تک پہنچی ہوں۔

اختتام سے قبل ایک مرتبہ پھر اس امر کا اعادہ کر دوں کہ میری ان ذہنی کاوشوں میں اگر آپ کو اپنا چہرہ، اپنے خدوخال، اپنے روز و شب، اپنا عہد، اپنی تمام نعمتوں، برکتوں یا مایوسیوں اور ناکامیوں کے ساتھ نظر آئے تو مجھے اپنی دعاؤں میں شریک رکھئے گا۔ میرے شعری مسلک کی اساس یہ ہے:

موضوعِ فکر روح رہی یا بدن رہا
لیکن مری نظر میں تغزّل کا فن رہا

منظر ایوبی

پس منظر

نام ــــــ عزیز احمد ایوّبی

تخلص ــــــ منظؔر

دادا کا نام ــــ علی بخش ایوّبی

والد کا نام ــــ علی احمد ایوّبی

والدہ کا نام ــــ حمیدہ بانو

بھائی ــــــ امیر احمد ایوّبی

بہن ــــــ قیصر جہاں، مومنہ خاتون مرحوم

تاریخِ پیدائش۔ ۴/ اگست ۱۹۳۲ء بروز جمعرات مطابق یکم ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ

مقام ــــــ بدایوں (روہیلکھنڈ) یو.پی. بھارت

شادی ــــ ۲۴/ اپریل ۱۹۵۰ء

بیگم ــــ حبیبہ خاتون

بیٹے ــــــ شہاب۔ نایاب۔ شاداب۔ کاشف

بیٹیاں ــــ حجاب۔ رباب۔ سحاب۔ لبنیٰ۔ کہکشاں

ہجرت ــــ ۳/ مئی ۱۹۵۰ء

تعلیم ــــــ (۱) میٹرک، انٹر کامرس (بدایوں) (۲) ادیب فاضل (لاہور) (۳) بی۔ کام (کراچی) (۴) ایم اے (کراچی)

ملازمت ــــ (۱) مرکزی وزارتِ عمال۔ کراچی (۱۹۵۰ء تا ۱۹۶۰ء)

(۲) محکمۂ تعلیم۔ (۱۹۶۱ء تا دمِ تحریر)

ادارت ــــ نائب مدیر (اعزازی) ماہنامہ "ہم قلم" پاکستان رائٹرز گلڈ۔ کراچی

ادب ــــ مقالہ :- اردو شاعری میں نئے موضوعات کی تلاش۔ ریڈیائی فیچر اور ڈرامے

حمدِ باری تعالیٰ

میں بندہ تو رب میرا
تجھ سے نام و نسب میرا
جان و تن کا حاکم تو
میں فانی اور دائم تو
علم و ہنر کی دولت دی
فکرِ سخن کی جرأت دی
عقل عطا کی ذہن دیا
لکھنے پر مامور کیا
جو عالم تھا آنکھوں میں
لکھّا میں نے حرفوں میں

کوہِ نوا تسخیر کیا
لمحوں کو زنجیر کیا
خوابوں کو کچھ رنگ دیا
سازوں کو آہنگ دیا
کاخِ جنوں ہموار کیا
قصرِ انا مسمار کیا
گھاؤ بھرے ہر سینے کے
ڈھنگ سکھائے جینے کے
لیکن تیری دنیا کا
حال عجب ہے اے مولا
خیر و شر کی جنگ وہی
ساز وہی آہنگ وہی
میں تیرا کارندہ ہوں
نادم ہوں شرمندہ ہوں
جو بھی ہُوا میں کر گزرا
آئندہ اے میرے خدا

آنے والی نسلوں کو
دیس کے پیارے لوگوں کو
سچّائی کی راہ دِکھا
جینے کے آداب سِکھا
یہ دھرتی یہ پاک وطن
یہ میرا آزاد چمن
جسم بھی ہے اور جان بھی ہے
جو میری پہچان بھی ہے
اس کو دائم ۔ زندہ رکھ
قائم اور پائندہ رکھ

نعت

ظلمتیں اوج پر ہیں ضیا چاہیئے
پھر چراغِ رخِ مصطفیٰؐ چاہیئے

صرف باتوں سے بنتا نہیں کارِ دیں
اتّباعِ رسولِ خدا چاہیئے

رہگزر رہگزر روشنی ہے مگر
اس جبیں کو ترا نقشِ پا چاہیئے

تیرا دیدار ہے حاصلِ زندگی
چشمِ بے خواب کو اور کیا چاہیئے

سب کو دعویٰ ہے عشقِ نبی کا مگر
عشق کے واسطے حوصلا چاہیئے

○

کبھی زمیں تو کبھی چرخ کے عتاب میں ہوں
نہ پوچھ تجھ سے بچھڑ کر میں کس عذاب میں ہوں

مرا مزاج تغیّر، مری سرشت سفر
بہ رنگِ عصر نمایاں ہر انقلاب میں ہوں

پہاڑ جیسے مکیں، زلزلوں کی نذر ہوئے
میں ایک خانماں برباد کس حساب میں ہوں

مرے وجود کو خطرہ نہیں زمانے سے
میں زندہ حرف ہوں محفوظ ہر کتاب میں ہوں

یہ سوچ زندہ ہوں اس کربِ زار میں کیسے
نہ پوچھ نوحہ کناں کیوں کسی کے باب میں ہوں

مری نظر میں کھلے ہیں حقیقتوں کے گلاب
تجھے یہ وہم کہ میں لالہ زارِ خواب میں ہوں

میں جی رہا ہوں ذرا حوصلہ تو دیکھ مرا
اسیر کب سے تری یاد کے سراب میں ہوں

یقین کون کرے میری بے گناہی کا
بندھا ہوا تری زنجیرِ احتساب میں ہوں

○

پہلے نفرت کی گھنی باڑ ہٹائی جائے
فصل پھر چاہ کی سینوں میں اُگائی جائے

اب تو ہر سمت سے آنے لگے پتھر لوگو
حرمتِ شیشہ گراں کیسی بچائی جائے

میں بھی مخلص ہوں ترا عشق بھی سچّا ہے تو پھر
نطق و لب پر کوئی قدغن نہ لگائی جائے

سارے ہی خواب تو جھوٹے نہیں ہوتے پھر بھی
خواب ہی خواب میں کیوں عمر گنوائی جائے

خون سے پاٹ تو دی ہم نے ہوس کی ندی
برف کی ناؤ بھی کچھ روز چلائی جائے

میں ترے گھر کا دیا ہوں، تو بھروسہ کر مجھ پر
شب کی ہر بات مرے علم میں لائی جائے

دستِ گلچیں میں ہو ہر شاخِ ثمردار تو پھر
بات کیوں سبزہ و گل کی نہ اُٹھائی جائے

دُوریاں اور بھی بڑھ جائیں گی یوں تو پیارے
میری ایک ایک خطا مجھ کو بتائی جائے

شعلۂ فکر فروزاں ہو تو منظر کیسے
اس طرف جاؤں، جدھر ساری خدائی جائے

○

تیرہ بختو، رنگِ شب اُڑنے سے کیا ہو جائے گا
بس ذرا سی روشنی کا آسرا ہو جائے گا

وا کئے جائیں گے کیا اس وقت آنکھوں کے کواڑ
جب پسِ دیوار کوئی حادثہ ہو جائے گا

آہنی پیکر ہیں ہم یا صرف پتلے موم کے
فصلِ سنگ آئی تو اب کے فیصلہ ہو جائے گا

ترکِ رسم و راہ سے پہلے نہیں سوچا تھا کیا
زندگی بھر کے لئے کوئی جدا ہو جائے گا

کیا خبر تھی بادبانِ آرزو کھلنے کے بعد
ہر مسافر کشتیٔ جاں کا خدا ہو جائے گا

قافلہ در قافلہ ہوں گے تمہارے ساتھ لوگ
ہم کسی منزل پہ بچھڑے بھی تو کیا ہو جائے گا

آسمانوں اور خلاؤں میں سفر کرنے کے بعد
آدمی کیا اپنے قد سے بھی بڑا ہو جائے گا

تم تو اظہارِ عقیدت کر کے چُپ ہو جاؤ گے
شہرِ جاں میں اک نیا فتنہ بپا ہو جائے گا

خوں رُلاتی ساعتیں جب رُوح کو تڑپائیں گی
عشق کا سارا نشہ منظر ہوا ہو جائے گا

○

عجیب شخص ہوں یادوں کے لالہ زار میں ہوں
جو وقت بیت گیا اس کے انتظار میں ہوں

گھنے درخت ڈریں احتسابِ موسم سے
میں ایک سُوکھا ہوا پیڑ کس شمار میں ہوں

مزاجِ گردشِ دوراں ترا قصور نہیں
میں آج اپنے ہی کھینچے ہوئے حصار میں ہوں

یہ کیسے رنگ دکھائے ہیں موسموں نے مجھے
نہ اپنے بس میں نہ مَیں تیرے اختیار میں ہوں

نہ اپنے گھر میں سُکوں ہے نہ تیرے کوچے میں
عجیب شہر ہے منظرؔ عجب دیار میں ہوں

○

آئے ہیں دارِ طلب میں تو مسیحاؤں سے
شدّتِ کرب کا اظہار ہی کرتے جائیں

ریزہ ریزہ ہو نہ کیوں کر یہ مرا جسم کہ جب
ایک اک کر کے سبھی خواب بکھرتے جائیں

مجھ سے اتنی ہی عقیدت ہے تو یہ ماہ و نجوم
روشنی بن کے مرے دل میں اُترتے جائیں

کر لیا اس لئے ہر جرم کا اقرار کہ وہ
جاتے جاتے کوئی الزام نہ دھرتے جائیں

کیا یہی عزمِ سفر لے کے چلے تھے منظرؔ
منزلیں آئیں تو ہم لوگ بکھرتے جائیں

○

پہلے شکوہ تھا کہ آزادئ افکار تو ہو
اب یہ رونا ہے کہ پیرایۂ اظہار تو ہو

تو مرے ساتھ چلا ہے تو میں اس سوچ میں ہوں
بارشِ گل نہ سہی، سایۂ دیوار تو ہو

لوگ دیکھیں تو سہی کارگہِ شیشہ گراں
ضربِ غم ایسی لگے دل پہ کہ جھنکار تو ہو

ہم تو ہیں آج بھی پابندِ رہ و رسمِ وفا
دستِ قاتل میں مگر تیغِ جگر دار تو ہو

میں وہ شاعر ہوں کہ لفظوں سے تراشوں پیکر
میرے اِس فن کا مگر کوئی پرستار تو ہو

کیسے گزرے گا غمِ ہجر کا موسم لوگو
ذکرِ گیسو نہ چھڑے، تذکرۂ دار تو ہو

جو گزرنا ہے گزر جائے ہمیں پر منظرؔ
آنے والوں کے لئے راستہ ہموار تو ہو

○

کبھی خزاں تو کبھی حلقۂ بہار میں ہے
جہاں کہیں بھی ہے وہ میرے اختیار میں ہے

تمام شہر اُسے اجنبی سا لگتا ہے
نہ جانے کون سا موسم نگاہِ یار میں ہے

سفر طویل ہے کچھ دیر کیوں نہ سستا لوں
شجر گھنا بھی ہے اور میری رہگزار میں ہے

سنانِ ہجر کا ہر وار دل پہ سہہ لے گا
ابھی تو اتنی سکت تیرے جاں نثار میں ہے

جواب کیسے ملے مجھ کو میری چاہت کا
تمام شہر ترے عشق کے حصار میں ہے

گئی رُتوں نے تجھے کیا صلہ دیا ہے جو تو
اک اور موسمِ رنگیں کے انتظار میں ہے

قرارِ جاں نہ اِدھر ہے نہ اُس طرف منظرؔ
جو میرے گھر میں سماں ہے وہ کوئے یار میں ہے

○

گیسوؤں کی نکہت ہے آنچلوں کے سائے ہیں
ہم بڑے اندھیروں سے روشنی میں آئے ہیں

اے زمیں نہیں اُٹھتا تجھ سے بوجھ انساں کا
لوگ اپنے کاندھوں پر آسماں اُٹھائے ہیں

جسم و جاں کے اندیشے رنگ لائے ہیں کیا کیا
کل تلک جو اپنے تھے آج وہ پرائے ہیں

دن ڈھلے تو ہم دیکھیں نامراد سورج نے
کتنے گھر اُجاڑے ہیں کتنے گھر جلائے ہیں

ماتم اس گئی رُت کا کب تلک کریں پیارے
جب بھی بند ٹوٹے ہیں انقلاب آئے ہیں

آنکھ آنکھ ویرانی، روح روح سنّاٹا
ہم ہیں دشتِ غربت کے پیڑ ہیں نہ سائے ہیں

دربدر بگولوں کا رقص دیکھنے والے
دیکھ تیرے گھر پر بھی بجلیوں کے سائے ہیں

تیرے پیار کی خوشبو راس آگئی ورنہ
بادِ گل کے جھونکے تو بار بار آئے ہیں

اپنے اور پرائے کا امتیاز کیا معنی
خشت و سنگ تو منظر ہر طرف سے آئے ہیں

○

کن نگاہوں سے فسوں کاریٔ موسم دیکھوں
چھین لیں مجھ سے مری جرأتِ گفتار درخت

دستِ گلچیں نے سلیقے سے تراشا ہے انھیں
ہیں مرے عہد کے مُنہ بولتے شہکار درخت

تو مرے باغِ تمنّا سے کچھ اس طرح گزر
دیکھ پائیں نہ ترے گیسو و رخسار درخت

ذکر اس طرح نہ کر باغ کی شادابی کا
لے اُڑیں پھر نہ تری نکہتِ گفتار درخت

دُور سے تیری طرح سادہ و رنگیں ہیں مگر
دیکھئے چھُو کے تو ہیں کتنے پُراسرار درخت

اب نہ آئے گا کوئی ہاتھ میں پتھر لے کر
اب نہیں صحنِ چمن میں کوئی پھل دار درخت

گر چکی ٹوٹ کے ہر شاخ مگر میری طرح
گردشِ وقت سے ہیں برسرِ پیکار درخت

تونے اس دشت میں تنہا بھی سفر کر دیکھا
بن گئے خود ہی تری راہ میں دیوار درخت

کُہر میں ڈوب گئے شہر کے سب نقش و نگار
کس طرح آئے نظر کوئی طرح دار درخت

بڑھ کے ہر شاخ کو سینے سے لگاؤ لوگو
سنگ کی زد پہ ہے ایک ایک ثمردار درخت

میں نے اس باغ کو سینچا ہے لہو سے منظر
اس حقیقت سے کرے گا کوئی انکار درخت

○

ہر رگ و پے میں اُترتا ہوا نشتر دیکھوں
زندگی زہر ہے اس زہر کو پی کر دیکھوں

کیا اسی واسطے آنگن میں لگایا تھا درخت
رات دن سر پہ برستے ہوئے پتّھر دیکھوں

کیسے اندازہ کروں شہر کی ویرانی کا
بارشِ سنگ میں کیا گھر سے نکل کر دیکھوں

دائرہ زیست کا ہر آن سمٹتا جائے
اور خوابوں کا یہ عالم کہ برابر دیکھوں

ایک عالم ہے تحیّر کا نگاہوں پہ محیط
تجھ کو دیکھوں تو کسی اور کو کیونکر دیکھوں

دادِ فن دے کہ نہ دے یاد تو رکھے دنیا
رنگ ایسا تیری تصویر میں بھر کر دیکھوں

تو مری دسترسِ شوق سے باہر تو نہیں
آئینہ جب بھی اٹھاؤں ترا پیکر دیکھوں

شدّتِ کرب سے ہے دل میں قیامت برپا
اس سے نمٹوں تو ترے شہر کا منظر دیکھوں

○

دل دُکھا گیا اب کے موسمِ چمن کیا کیا
یاد آئی ہے تیری بوئے پیرہن کیا کیا

میں ہوں اور تنہائی شہر شہر رسوائی
گل کھلا گیا میرا مسلکِ سخن کیا کیا

خونِ دل سے لکھتا ہوں تلخیاں زمانے کی
پھر بھی مجھ سے مانگے ہے جانے میرا فن کیا کیا

کفر اور ایماں کے ارتباطِ باہم پر
کروٹیں بدلتے ہیں شیخ و برہمن کیا کیا

شعلۂ رقابت کو گل رخو ہوا مت دو
آندھیوں کی زد پر ہے ان دنوں چمن کیا کیا

ساکنانِ شہرِ جاں سُرخ رُو ہوئے آخر
رہزنِ محبّت نے کر لئے جتن کیا کیا

گردشِ زمانہ کی نذر ہو گئے منظر
چاند سے حسیں چہرے پھول سے بدن کیا کیا

○

جرمِ عشق کی آخر اور کیا سزا دو گے
روح تو جدا کر دی تن بھی کیا جلا دو گے

کون یاں سمجھتا ہے پیار کی زباں لوگو
بابِ شہرِ خوباں پر کب تلک صدا دو گے

پھول بن کے مہکے گا چاندنی کے اُبھرے گا
زخمِ دیدہ و دل کو جس قدر ہوا دو گے

تم کوئی پیمبر ہو، آسماں سے اُترے ہو
جو زمیں کے سینے کی ہر جلن مٹا دو گے

پُر سکوں فضاؤں میں زہر گھولنے والو
کیا نگارِ ہستی کا بانکپن مٹا دو گے

صبح تک شبِ غم کی کھڑکیاں کھلی رکھ کر
کیا ہماری پلکوں کے سب دیئے بجھا دو گے

عہدِ غم نہ گزرا تو وہ گھڑی بھی آئے گی
میں تمھیں پکاروں گا تم مجھے صدا دو گے

طے کیا ہے مل جل کر آگ کا سفر ہم نے
تم مری رفاقت کو کس طرح بھلا دو گے

سب ہی گھر سے نکلے ہیں لے کے سر ہتھیلی پہ
کس کی راہ روکو گے کس کو راستا دو گے

آج میری خلوت میں، کل تمہاری جلوت میں
ایسے شخص کا لوگو کیا اتا پتا دو گے

راہِ دل کھلی رکھنا شہرِ عشق میں ورنہ
زیست سی گراں شے کو مفت میں گنوا دو گے

○

بچھڑ کے تجھ سے کسی دیس یا نگر میں رہا
ہمیشہ ایک ہی موسم مری نظر میں رہا

عذابِ جاں تھا دل و ذہن کا کھنچاؤ مگر
معاملہ تھا کچھ ایسا کہ گھر کا گھر میں رہا

سُنی نہ میرے بدن کی پکار لوگوں نے
تری وفاؤں کا سورج نظر نظر میں رہا

پٹک کے رہ گئی ہر موج اپنا سر لیکن
مرے جنوں کا سفینہ سدا بھنور میں رہا

یہ اپنی ذات پہ کیا کم ستم کیا میں نے
کہ اجنبی کی طرح آپ اپنے گھر میں رہا

گیا نہ دھیان کبھی اپنے خدّ و خال کی سمت
دماغ و دل تو سدا اس کی رہگزر میں رہا

وہ چاند تھا تو اُترتا کسی کے آنگن میں
یہی مباحثہ شب بھر ہمارے گھر میں رہا

ہر انقلاب نے روکے مرے قدم منظرؔ
مگر یہ میرا مقدّر کہ میں سفر میں رہا

○

تم اپنے عہدِ محبّت پہ خود ہی غور کرو
مجھے تو اپنی تباہی کا کچھ گلہ بھی نہیں

○

وصال و ہجر کے قصّے نہ یوں سُناؤ ہمیں
اب اس عذابِ شب و روز سے بچاؤ ہمیں

کسی بھی گھر میں سہی روشنی تو ہے ہم سے
نمودِ صبح سے پہلے تو مت بُجھاؤ۔ ہمیں

نہیں ہے خونِ شہیداں کی کوئی قدر یہاں
لگا کے داؤ پہ ہم کو نہ یوں گنواؤ ہمیں

تمام عمر کا سودا ہے ایک پل کا نہیں
بہت ہی سوچ سمجھ کر گلے لگاؤ ہمیں

گزر چکے ہیں مقامِ جنوں سے دیوانے
یہ جان لینا اگر کل یہاں نہ پاؤ ہمیں

ہمارے خوں سے نکھر جائے غم تو کیا کہنا
بڑھاؤ دستِ ستم، دار پر چڑھاؤ ہمیں

کرشمہ سازئ فکر و نظر سے کیا حاصل
بنے ہو خضر تو پھر راستہ دکھاؤ ہمیں

یہ لمحہ بھر کا تصور تو جان لیوا ہے
جو یاد آؤ تو تا عمر یاد آؤ ہمیں

کتابِ عشق ہیں لیکن نہ اتنی فرسودہ
کہ بے پڑھے ہی فقط میز پر سجاؤ ہمیں

نہیں ہے عشرتِ منزل نصیب میں، نہ سہی
نجاتِ غم کی کوئی راہ تو سجھاؤ ہمیں

اُجڑ نہ جائے عروسِ سخن کی مانگ کہیں
خیال و فن کی نئی جنگ سے بچاؤ ہمیں

○

بہت پڑھی حُسن کی حکایت بہت لکھا حال عاشقی کا
ملا نہ اب تک سراغ لیکن دل و نظر کی سپردگی کا

ہزار چہرے نظر سے گذرے، ہزار سورج اُفق پہ اُبھرے
مگر ہر اک رہگزارِ دل پر ہنوز پہرہ ہے تیرگی کا

محاذِ جاں پر شکست کھا کر بھی بند ہے دل کی آنکھ لوگو
وہی بدن کی پکار ہر سُو، وہی طریقہ ستمگری کا

ہواؤں میں ہڈیوں کی بُو ہے، فضا ابھی تک لہو لہو ہے
کرے کہاں تک علاج کوئی نگاہ و دل کی فسردگی کا

ضمیرِ انساں کی نعش اُٹھائے نگر نگر پھر رہا ہوں لیکن
نہ چشمِ پُرنم، نہ شورِ ماتم، عجیب عالم ہے بے حسی کا

ہمیں ہدف ہیں ملامتوں کے، ہمیں نشانہ ہیں آفتوں کے
سبب کوئی اور بھی تو ہو گا نگاہِ جاناں کی برہمی کا

بڑھی دکانِ غزل میں جب سے گرانیٔ جنسِ عارض و لب
نہ گاہکوں کی ہے بھیڑ منظرؔ نہ گرم بازار شاعری کا

○

اک ایسے بند گنبد کی صدا ہوں
کہ خود اندر ہی اندر گونجتا ہوں

ہوا کی زد پہ کب سے جل رہا ہوں
اگرچہ ایک مٹّی کا دیا ہوں

لرز اُٹھتا ہوں جب اپنے ہی گھر کے
در و دیوار ہلتے — دیکھتا ہوں

کہاں لائی ہے میری خاک اُڑا کر
زسرتا پا بگولوں میں گھرا ہوں

ہزاروں سال روئے گا زمانہ
میں اپنے دَور کا اک مرثیا ہوں

بجا "سچ بولنا مردانگی ہے"
مگر سچ بول کر پچھتا رہا ہوں

یہ پانی سر سے اونچا ہو رہا ہے
مگر میں ہوں کہ دریا میں کھڑا ہوں

مرے ہاتھوں میں یہ جو اک قلم ہے
میں اس کی قدر و قیمت جانتا ہوں

نظر کیوں روز و شب رکھتا ہے مجھ پر
ترے نزدیک جب میں مر چکا ہوں

چلاؤ سائے کا جادو نہ منظرؔ
کہ میں اس دھوپ میں چنگا بھلا ہوں

○

اِسی دشتِ غزالاں میں ملا تھا
وہ اک سایہ جو مجھ سے بھاگتا تھا

ہمارے حوصلوں نے لاج رکھ لی
اگرچہ راستہ کانٹوں بھرا تھا

ہمارے بعد بھی کچھ سرپھروں کو
سُنا ہے دار پر کھینچا گیا تھا

ہزاروں سائے تھے رقصاں نظر میں
مگر میں دھوپ کی زد پر کھڑا تھا

وہ سورج تھا مگر کرنوں کی صورت
مرے چاروں طرف بکھرا ہوا تھا

تمہیں نے دیر کی آنے میں ورنہ
سحر تک دل کا دروازہ کھلا تھا

یہی وہ حضرتِ انساں ہیں جن کو !
فرشتوں نے کبھی سجدہ کیا تھا

ق

مری نظموں کو آئینہ بنا کر
وہ پہلے اپنا چہرہ دیکھتا تھا

پھر اپنی میز پر ان کو سجا کر
نہ جانے دل میں کیا کیا سوچتا تھا

اسی بستی میں تھا آباد منظرؔ
اسے میری محبت سے گلا ____ تھا

○

بچھڑ کر مجھ سے پہروں سوچتا ہے
کہ وہ کیا کچھ نہ تھا پر آج کیا ہے

نہ مانی پہلے میری بات اس نے
اب اپنے سائے سے بھی کانپتا ہے

وہ ہیرا ہے مگر دنیا کے ہاتھوں
خود اپنی قدر و قیمت کھو چکا ہے

مسافر ہوں چلا جاؤں گا اُٹھ کر
دریچہ کھول کر کیا دیکھتا ہے

اُڑا کر لے گئی کتنے ہی خیمے
بڑی سفّاک جنگل کی ہوا ہے

جلا دے گی مری قربت تجھے کیا
جو مجھ سے اس قدر تو کھنچ رہا ہے

کتابیں چاٹ کر کچھ علم و فن کی
بہت گہرائیوں میں جا چکا ہے

نہیں کچھ انسیت مجھ سے تو پھر کیوں
مرے اشعار پڑھ کر جھومتا ہے

وہ کوئی تبصرہ کرنے سے پہلے
مری غزلوں میں خود کو ڈھونڈتا ہے

لرز اُٹھے زمین و آسماں تک
یہ کس زخمی پرندے کی صدا ہے

○

ہمارا نام تو محفوظ ہے کتابوں میں
یہ اور بات کہ شامل نہیں نصابوں میں

اسے قریب سے دیکھا تو یوں ہوا محسوس
تمام عمر بھٹکتے رہے سرابوں میں

اُتر کے رُوح کی گہرائیوں میں دیکھ مجھے
بڑا سکون میسّر ہے ان خرابوں میں

گزر گیا ہو کوئی حادثہ نہ اس پر بھی
کئی دنوں سے نظر آ رہا ہے خوابوں میں

حدیثِ وقت ہوں ہر لوحِ جاں پہ نقش ہوں میں
مجھے نہ ڈھونڈ فقط عشق کی کتابوں میں

نہ کھل کے روئے نہ جی بھر کے ہنس سکے منظر
عجب نشہ تھا نئے دور کی شرابوں میں

○

ملا انہی کو زمانے میں رتبۂ سقراط
کہ جن سے زہر کا اک گھونٹ بھی پیا نہ گیا

پناہ مانگ رہے تھے جو طائرانِ قفس
ملی اجازتِ پرواز تو اڑا نہ گیا

جگر کا خون کیا، انگلیاں قلم کر لیں
ہمارا نام شہیدوں میں پر لکھا نہ گیا

لبوں پہ مہر لگی تھی تو صبر تھا دل کو
ملا جو اذنِ تکلم تو کچھ کہا نہ گیا

○

سودا بہارِ زیست کا مہنگا پڑا تو کیا
آئی دلوں کو راس نہ تازہ ہوا تو کیا

آسودگئ درد کی بنیاد تو پڑی
اس میں ہمارا خون بھی پانی ہوا تو کیا

کچھ روشنی ہمیں بھی عطا ہو تو بات ہے
خود اپنے گھر میں تم نے چراغاں کیا تو کیا

نکلے ہیں گھر سے ہم بھی قسم کھا کے دوستو
قاتل ہے کوئے یار کی آب و ہوا تو کیا

ہر سینۂ روش میں تڑپ تھی بہار کی
غنچوں کو صرف اذنِ تکلّم ملا تو کیا

ہر شیشہ آفتاب ہے، ہر موجِ مے کرن
محفل میں اک چراغ اگر بُجھ گیا تو کیا

نفرت کی تیز آنچ نے پگھلا دیے بدن
اب لاکھ رُونما ہو کوئی معجزا تو کیا

○

میں وہ بادل نہیں کہ بِن برسے
تپتے صحراؤں سے گزر جاؤں
اس کو پاسِ وفا نہیں، نہ سہی
اپنے وعدے سے کیوں مُکر جاؤں
ہو اجازت تو شعر کی صورت
میں تری روح میں اُتر جاؤں
اپنے منہ میں زبان رکھتے ہوئے
بے زبانوں کی طرح مر جاؤں؟
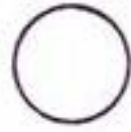
ہر آشنا ہو فرشتہ خصال کیا معنی
یہ معجزہ تو ہمیشہ پیمبروں میں ملا

کسی کی ذات کو ہم درمیاں میں کیوں لائیں
وہ راہزن تھا مگر ہم کو رہبروں میں ملا

سجا کے داغِ جبیں جب اندھیری شب میں چلا
تو میری چاہ کا سودا ابھی کچھ سروں میں ملا

میں کس بنا پہ اُسے پیکرِ وفا سمجھوں
وہ بُت شکن تھا تو کیوں آ کے بُت گروں میں ملا

خلوصِ جذبہ کہوں یا کمالِ فن منظر
کہ تیرے شعر کا چرچا سخن وروں میں ملا

○

کس کو یہاں شعورِ غم کون ستم شناس ہے
کل بھی رہا تھا جی اُداس آج بھی جی اُداس ہے

سُرخیٔ شام پر ہُوا، فصلِ بہار کا گماں
ورنہ چمن میں چار سُو ایک ہجومِ یاس ہے

اوڑھی ہوئی ہے باغ نے چادرِ رنگ و بو مگر
سبزہ و گل کے جسم پر تنگ ہر اک لباس ہے

کوئی نہیں جو پرچمِ عشق بلند کر سکے
دار و صلیب کی فضا کب سے اُداس اُداس ہے

دیدہ و دل لہو کریں، کس کے لئے غزل کہیں
شہر میں اک ترے سوا کون سخن شناس ہے

○

جنوں نے وحشتِ دل اس قدر بڑھا دی ہے
کبھی تجھے تو کبھی چاند کو صدا دی ہے

نہ مشعلیں تھیں فروزاں نہ عاشقوں کا جلوس
کسی نے شہر میں جھوٹی خبر اُڑا دی ہے

کہاں کی شرطِ وفا اور کہاں کا پاسِ ادب
یہ رسم، اہلِ محبّت نے اب اُٹھا دی ہے

کہاں تھا اتنا شعورِ حیات لوگوں میں
کسی نے شعلۂ احساس کو ہوا دی ہے

ہوا نے آہ بھی کھینچی تو یوں لگا جیسے
کسی نے مجھ کو بڑی دُور سے صدا دی ہے

امیرِ شہر سدا بدگماں رہا مجھ سے
غریبِ شہر نے اکثر مجھے دعا دی ہے

نہ رہزنوں میں تھے ہم اور نہ رہنماؤں میں
ہمیں حضور نے کس جرم کی سزا دی ہے

ہمیں نہیں ہیں پریشاں خیال آج کی شب
ستم گروں نے تری نیند بھی اُڑا دی ہے

شکستہ پا تھے مگر حوصلہ نہیں ہارا
تمہارے واسطے اک رہگزر بنا دی ہے

عجب نہیں کہ زمانہ اسی کو یاد رکھے
وہ زندگی جو ترے کھوج میں گنوا دی ہے

یہ شہرِ ستم ہے یہاں تمہارے سوا
دُکھوں کے بوجھ نے سب کی کمر جھکا دی ہے

ہر ایک شخص فرشتہ ہے آشناؤں میں
یہ بات کس نے ترے ذہن میں بٹھا دی ہے

○

وہ اک صدا جو نمایاں تھی سب صداؤں میں
بلند ہوتے ہی گم ہو گئی فضاؤں میں

بہار آ نہ سکے گی ہمارے خوں کے بغیر
وہ لاکھ رنگ بھریں پھول کی قباؤں میں

گلی گلی میں گھمس ہے مکاں مکاں میں گھٹن
کلام کیجئے آ کر کھلی فضاؤں میں

نہ جانے کس نے اچانک یہ زہر گھول دیا
بڑا سکوں تھا ترے شہر کی فضاؤں میں

نظر اٹھا کہ ابھی تک مری وفا کے گلاب
مہک رہے ہیں ترے دیس کی فضاؤں میں

مجھے یہ ڈر ہے کہ وہ خود بھی کھو نہ جائے کہیں
جو مجھ کو ڈھونڈنے نکلا ہے اِن گھٹاؤں میں

تری نگاہ نے بخشا ہے حوصلہ جن کو
بسا رہے ہیں نئی بستیاں خلاؤں میں

زمیں کی مانگ سجالیں تو پھر چلیں منظرؔ
رکھا ہی کیا ہے ابھی چاند کی فضاؤں میں

عظمتِ لوح وقلم تم جو بڑھانا چاہو
زہر پی لیں گے اگر زہر پلانا چاہو

ایسے ماحول سے تم دُور ہی اچھے کہ جہاں
مہر لگ جائے اگر ہونٹ ہلانا چاہو

ایک در بند ہوا ہے تو کوئی بات نہیں
اور بھی در ہیں جو آواز لگانا چاہو

پردۂ ساز نہیں ہوں کہ جسے چھیڑ کے تم
میری آواز سے آواز مِلانا — چاہو

میں ہوں وہ رنگ وہ خوشبو وہ شرارہ کہ ابھی
اُڑ کے آجاؤں اگر پاس بُلانا چاہو

ہم بظاہر خس و خاشاکِ چمن ہیں لیکن
آگ بن جائیں اگر آگ لگانا چاہو

سنگ کیا چیز ہے سُولی پہ بھی نیند آجائے
تم جو دامن کی ہوا دے کے سُلانا چاہو

میں کوئی شمعِ سیہ خانۂ مفلس تو نہیں
تم جو پھونکوں سے سرِ شام بُجھانا چاہو

بھُول کر بھی نہ اُسے یاد کرو اے منظرؔ
تم جو تنہائی کا احساس مٹانا چاہو

○

ہزار دیدہ و دل کی رقابتیں دیکھیں
ہیں آج جیسی نہ ایسی عداوتیں دیکھیں

چلے تو راہ میں آنکھیں بچھائیں لوگوں نے
رُکے کہیں پہ تو کیا کیا قیامتیں دیکھیں

نظر نہ آیا کرشمہ ترا کبھی باہر
درونِ خانہ تو اکثر کرامتیں دیکھیں

حصارِ ذات میں ایسا ہوا مقیّد تو
کبھی کسی نے نہ تیری لطافتیں دیکھیں

تمہاری آنکھ ہے شاہد ہمارا دل بھی گواہ
نہ اتنے رنج اُٹھائے نہ آفتیں دیکھیں

دلِ غریب ترستا رہا وفا کے لئے
امیرِ شہر پہ اکثر عنایتیں دیکھیں

پڑے رہے ترے کوچہ میں سنگِ رہ کی طرح
ستونِ دار سے گزرے تو رفعتیں دیکھیں

تمہارا ساتھ جو چھوٹا تو ہر جگہ ہم نے
دلوں میں کھوٹ نظر میں شرارتیں دیکھیں

یہ شہرِ زندہ دلاں ہے مگر یہاں پر بھی
اداشناس نگاہوں پہ تہمتیں دیکھیں

یہی بہت ہے کہ دو چار پر مرے معبود
نزول ہوتے ہوئے تیری رحمتیں دیکھیں

○

یہ ماہتاب سے چہرے یہ جسم کومل سے
بہت دنوں سے نظر آ رہے ہیں بے کل سے

ہمیں خبر تھی سمندر پہ جا کے برسے گا
تمہیں نے آس لگائی تھی اُڑتے بادل سے

عجب نہیں کہ انہی پر ہو ختم دورِ ستم
جو لوگ تجھ کو نظر آ رہے ہیں پاگل سے

سُنا ہے ٹوٹ کے برسا ہے کچھ زمینوں پر
ہمیں تو ایک بھی قطرہ مِلا نہ بادل سے

بغیر پڑھے کسی بُت کو پھر خدا کہہ دوں
ابھی تو نکلا ہوں اک بے وفا کے چُنگل سے

کہو نسیمِ سحر سے کوئی علاج کرے
یہ زخم خشک نہ ہوگا تمہارے آنچل سے

کسی حسین سہارے کی آس میں منتظر
نکل سکا ہوں نہ اب تک دکھوں کے دلدل سے

○

اک اور ابھی تاریخِ ستم، کرنی ہے رقم، اے اہلِ کرم
کچھ دیر ہماری راہوں میں، یہ گردشِ دوراں رہنے دو
کیا جانیے کب اربابِ جنوں، اعلانِ بغاوت کر بیٹھیں
اس موسم میں ہر وقت کھلا دروازۂ زنداں رہنے دو
ان تیرہ فضاؤں میں منظرؔ، یہ شعلۂ جاں ہی سب کچھ ہے
اس شعلۂ جاں کو سینے میں ہر وقت فروزاں رہنے دو

○

اس درجہ گھٹن ہے کہ ترے شہر کی خلقت
جینے کے لئے تازہ ہوا مانگ رہی ہے

سب کچھ تری تقریر کا اعجاز ہے واعظ
یہ آگ جو سیلابِ بلا مانگ رہی ہے

اے چارہ گرِ وقت صدا کیوں نہیں دیتا
دنیائے ستم تجھ سے دوا مانگ رہی ہے

جذبات سے ہٹ کر کبھی سوچا ہے رفیقو
تشکیلِ غزل آپ سے کیا مانگ رہی ہے

اے لالہ رخو، گل بدنو، غور سے دیکھو
تعمیرِ چمن خون نیا مانگ رہی ہے

حیرت ہے کہ ہر انجمنِ کج کلہی ــــ آج
کاشانۂ مفلس سے ضیا مانگ رہی ہے

کچھ ہم ہی نہیں گردشِ حالات کی زد پر
دنیا ترے آنچل کی ہوا مانگ رہی ہے

اب آکے نئے موڑ پہ شہروں کی سیاست
کچھ دشت نوردوں کا پتا مانگ رہی ہے

آزاد تھے جب سبزہ و گل فکرِ نمو سے
یہ فصل وہی آب و ہوا مانگ رہی ہے

یارانِ وفا کیش کہاں سو گئے منظرؔ
یہ خاک شہیدوں کا صلا مانگ رہی ہے

○

وہ بُلائے مگر نہ جاؤں میں
اتنی جرأت کہاں سے لاؤں میں

اتنا نزدیک ہوں کہ وہ مجھ کو
لاکھ ڈھونڈے نظر نہ آؤں میں

لے کے ہاتھوں میں پیار کا کشکول
عمر بھر کیا صدا لگاؤں میں

مجھ پہ ہر دم کڑی نظر رکھنا
اپنے وعدوں سے پھر نہ جاؤں میں

گاہے گاہے پکارتے رہنا
قافلہ سے بچھڑ نہ جاؤں میں

میرے افعال پر نظر رکھنا
سیلِ دوراں میں بہہ نہ جاؤں میں

میں نے کیا خود پہ کم ستم ڈھائے
تجھ پہ الزام جو لگاؤں میں

دل پہ کتنا ہی اختیار سہی
آدمی ہوں بہک نہ جاؤں میں

روز اک حکم روز اک افتاد
اس کشاکش میں مر نہ جاؤں میں

اے مرے فن کی بولتی تصویر
آ تجھے آئینہ دکھاؤں میں

○

کتنا دراز سلسلۂ زلفِ یار تھا
زنداں میں بیٹھ کر بھی خیال بہار تھا

کچھ دیر بھی چمن پہ نہ کھل کر برس سکا
ابرِ بہار، دوشِ ہوا پر سوار تھا

رہنے لگے ہو تم بھی پریشاں مری طرح
تم کو تو اپنے دل پہ بڑا اختیار تھا

ہر شخص کیوں جبیں کو جھکاتا مرے حضور
کیا میں بھی کوئی نقشِ کفِ پائے یار تھا

سمجھے تھے اہلِ ہوش جسے عہدِ رنگ و بو
محسوس اب ہوا کہ طلسمِ بہار تھا

سرزد ہوئی ہمیں سے خطا ورنہ وہ کبھی
خلوت پسند تھا نہ تغافل شعار تھا

درپردہ کر رہے ہیں وہی لوگ سازشیں
کل تک تری وفا پہ جنھیں اعتبار تھا

کس گوشۂ چمن میں نہاں تھے حضور آپ
جب ہر لباسِ غنچہ و گُل تار تار تھا

اس بے وفا کے شہر میں رہنا پڑا ہمیں
منظر ازل سے جس کا چلن آشکار تھا

○

دریا دلی میں کس کے برابر نہیں ہوں میں
اک بوند ہوں اگرچہ سمندر نہیں ہوں میں

رکھتا ہوں گرد و پیش کے ماحول پر نظر
محبوس اپنی ذات کے اندر نہیں ہوں میں

مجبوریٔ حیات نے سرکش بنا دیا
اپنی سرشت میں کوئی خودسر نہیں ہوں میں

اندیشۂ خرابیٔ موسم نہیں مجھے
روحِ چمن ہوں، شاخِ گلِ تر نہیں ہوں میں

اظہارِ فن کی زندہ حقیقت ہوں دوستو
دیکھو مجھے کہ خواب کا پیکر نہیں ہوں میں

کب تک ترے حضور تماشہ بنا رہوں
کھولوں نہ کیوں زباں کہ پتھر نہیں ہوں میں

گیتوں سے زندگی کا بڑھاتا ہوں حوصلہ
بہتی ہوئی ندی ہوں، سمندر نہیں ہوں میں

کتنے دلوں کے در ہیں مرے واسطے کھُلے
اس روشنی کے شہر میں بے گھر نہیں ہوں میں

امروز کی صدا ہوں تو فردا کا اک پیام
تم جس کو ڈھونڈتے ہو وہ منظر نہیں ہوں میں

○

موجِ نگاہ جب تری تصویر پر گئی
پیمانۂ خیال میں سو رنگ بھر گئی

کشتِ دل و نگاہ کو سیراب کر گئی
جذبات کی ندی تھی چڑھی اور اُتر گئی

ہوتی غموں کی دھوپ تو بنتی سروں کا تاج
خوشیوں کی چھاؤں تھی اِدھر آئی اُدھر گئی

پھوٹی تھی جو دلوں کے اُفق پر نئی کرن
ذہنوں کے چند طاق سجا کر ٹھہر گئی

جو کام تیری زلف کا سایہ نہ کر سکا
وہ کام دوپہر کی کڑی دھوپ کر گئی

بارش تھمے تو خوئے فضا سے کروں یہ عرض
وہ دھند، وہ غبار، وہ مٹّی کدھر گئی

اب وقت ہے کہ پھول سے پوچھیں یہ خار و خس
اے جانِ صد بہار وہ رنگت کدھر گئی

منزل کی عشرتیں تھیں سبھی کی نگاہ میں
رستوں کے پیچ و خم پہ کسی کی نظر گئی

جچتا نہیں ہے کوئی بھی منظر نگاہ میں
تصویرِ یار دل کا عجب حال کر گئی

○

سحر ہوئی تو نظر آئے سینکڑوں چہرے
شبِ ستم تھی تو اک شخص بھی قریب نہ تھا

○

کب کوئی مجھ سا وفا پیکر ملا
عشق میں ہر شخص سوداگر ملا

ان دنوں دل کا سکوں نایاب ہے
بس یہی چیز چاہمیں گھر گھر ملا

دل میں کیا تھا اس کے کیا جانے کوئی
یوں تو وہ ہر شخص سے جھک کر ملا

کیا قیامت ہے تمہارے عہد میں
پھول کے بدلے ہمیں پتھر ملا

ہم ہی کچھ پابندِ رسم و راہ تھے
یوں سرِ راہے تو وہ اکثر ملا

غم گُساری کے لئے اس شہر میں
اک مِرا سایہ تھا جو اکثر ملا

کوئی محفل ہو ہمیں تنہائی کا
ہر جگہ بس ایک ہی منظر ملا

○

یہ رات بڑی سنگین سہی، اس رات سے مت ڈرنا یارو
اس رات کے ڈھلتے ہی پھر ہم اک صبحِ درخشاں دیکھیں گے
اس روح و بدن کے رشتے کو صیّاد کہاں تک توڑے گا
جس وقت بھی شعلہ اُٹھّے گا، ہم سوئے گلستاں دیکھیں گے
وہ لوگ کہ جن کے ہاتھوں سے تعمیر ہوئی بنیادِ چمن
وہ لوگ بھلا کن آنکھوں سے تخریبِ گلستاں دیکھیں گے
زلفوں کے گھنیرے سائے ہوں یا راہِ سفر کی دھوپ کڑی
ہر حال میں ہم اربابِ جنوں منظر کو غزل خواں دیکھیں گے

○

زنداں میں چپ رہے تو سرِ دار بولتے
ہم گردشِ جہاں کا بھرم کچھ تو کھولتے

آتی ہمیں سیاستِ دوراں تو رات دن
پھرتے نہ خالی ہاتھ زمانے میں ڈولتے

دکھلائے ہیں کچھ ایسے نئے موسموں نے رنگ
ہوتی اگر زباں تو در و بام بولتے

دل کا لہو جلا تو ہوئی کچھ تو روشنی
کس کس کو ہم اندھیروں میں ورنہ ٹٹولتے

ہوتی نظر میں عظمتِ آدم تو دوستو
میزانِ زر پہ یوں نہ محبّت کو تولتے

اچھا ہوا کہ حسرتِ قاتل نکل گئی
ورنہ دہانِ زخم خود اک روز بولتے

یارو شبِ ستم کے اندھیروں سے ڈر گئے
کچھ تو سحر کا رنگ فضاؤں میں گھولتے

ہم نے بھی لے لئے ہیں کچھ الزام اپنے سر
آخر وہ اپنے دل کو کہاں تک ٹٹولتے

○

جب کسی محفل میں یک جا چند دیوانے ہوئے
دار کے قصّے چھڑے زلفوں کے افسانے ہوئے

یوں تو آنے کو بہار آئی، چمن مہکا مگر
مطمئن اس رنگ و بو سے کتنے دیوانے ہوئے

نقشِ پا کی جستجو ہے اب نہ رہبر کی تلاش
سب ہی رستے ہیں ہمارے جانے پہچانے ہوئے

اے حریفِ ظلمتِ شب یہ بھی سوچا ہے کبھی
شمع پر قربان آخر کتنے پروانے ہوئے

ڈر گئے یارو ہمیں راہِ سفر کی دھوپ سے
لوگ راہوں پر کھڑے تھے چادریں تانے ہوئے

بستی بستی آفتابِ نو کا چرچا ہے مگر
آفتابِ نو سے روشن کتنے کاشانے ہوئے

جانے کیوں کل رات منتظمہ وشوں کے درمیاں
کچھ تری باتیں ہوئیں کچھ ان کے افسانے ہوئے

○

جو ترے انتظار میں گزریں
ایسے لمحے گراں نہیں ہوتے
شہرِ خوباں کو چھوڑنے والو
دل کے سودے کہاں نہیں ہوتے

○
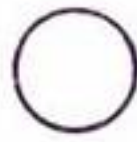
بڑی لچک ہے ترے عہد کے اصولوں میں
کہ سنگ و خشت بھی تولے گئے ہیں پھولوں میں

ہر آدمی ہو سراپا خلوص، ناممکن
یہ بات پائی ہے ہم نے فقط رسولوں میں

کبھی کھلونا سمجھ کر دلوں کو توڑ دیا
کبھی جُھلاتے رہے آرزو کے جُھولوں میں

ترے خیال کی رعنائیوں میں کھو جاؤں
وہ رنگ روپ وہ خوشبو کہاں ہے پھولوں میں

میں آدمی ہوں مگر صورتِ خس و خاشاک
کیا ہے رقص سدا دشت کے بگولوں میں

○

ہزار شدّتِ غم سے اُداس رہتا ہے
ترا خیال مگر دل کے پاس رہتا ہے

ترے لبوں کا تبسّم نہ چھن گیا ہو کہیں
کئی دنوں سے مرا جی اُداس رہتا ہے

بس اتنی بات پہ برہم ہیں تیرے شہر کے لوگ
کہ دُور رہ کے بھی تو میرے پاس رہتا ہے

قسم خدا کی اُسے آج تک نہیں دیکھا
بس اس کا سایہ مرے آس پاس رہتا ہے

وہی ہیں انجمنِ دل کی رونقیں لیکن
ترے بغیر یہ منظر اُداس رہتا ہے

○

تھپتھپاتی ہے کبھی نیند اُڑا دیتی ہے
لُطف کیا کیا ترے کوچے کی ہوا دیتی ہے

میرے آنگن میں بھی شب بھر کو اُتر اے مہتاب
کب سے اس گھر کی فضا تجھ کو صدا دیتی ہے

جو بھی ہوتا ہے حریفِ خمِ گیسو یا رب
تیری دنیا اُسے سُولی پہ چڑھا دیتی ہے

یہ سلگتے ہوئے لمحے، یہ پرندوں کی اُڑان
کسی طوفان کی آمد کا پتا دیتی ہے

ہم تو انساں ہیں فسوں کاریٔ موسم اکثر
آسماں بوس درختوں کو گرا دیتی ہے

ہم نے کیا کچھ نہ کیا عظمتِ فن کی خاطر
عظمتِ فن ہمیں اب دیکھئے کیا دیتی ہے

جب بھی سر اپنا ہتھیلی پہ لئے چلتا ہوں
زندگی دُور تلک مجھ کو صدا دیتی ہے

جو بگولوں کی طرح اُٹھتے ہیں ان کو منظرؔ
وقت کی لہر تہِ خاک سُلا دیتی ہے

○

رنگ لا کر ہی رہا آخر مرا ذوقِ جنوں
ریزہ ریزہ ہوں مگر پتھر سے ٹکراتا ہوں میں

منتشر ہر خواب میرا، مضمحل ہر آرزو
زندگی پھر بھی تری خاطر جیئے جاتا ہوں میں

جب بھی کوئی ضرب پڑتی ہے رگِ احساس پر
لوحِ جاں پر نقش کی صورت اُبھر آتا ہوں میں

سوچئے تو مجھ سے مستحکم بنائے زندگی
دیکھئے تو خواب کی صورت نظر آتا ہوں میں

سایۂ دستِ صبا میرے تعاقب میں نہ آ
برگِ آوارہ ہوں پل بھر میں بکھر جاتا ہوں میں

کوچہ و بازار میں ارزانیٔ حسنِ بتاں
اور میرے گھر کا یہ منظر کہ گھبراتا ہوں میں

○

پردۂ رنگ و بو رہے ہیں ہم
پھول کی آبرو رہے ہیں ہم

منزلِ عیش تھی کہ راہِ ستم
آپ کے روبرو رہے ہیں ہم

دم بتوں کا بھرا مگر ناصح
عمر بھر باوضو رہے ہیں ہم

کوچۂ یار ہو کہ تختۂ دار
ہر جگہ سرخرو رہے ہیں ہم

○

سب سے ناتا جوڑ کے منظر آخر کیا پھل پاؤ گے
اپنے گھر کو چھوڑ کے کس کس گھر کی آگ بجھاؤ گے

بات تو جب ہے اس بستی میں کوئی وفا کا نام نہ لے
ایک ہمیں کو زنجیریں پہنا کر کیا پھل پاؤ گے

ہم ہی دیں گے ساتھ تمہارا سورج سر پر آنے دو
اوس کے قطروں سے تم کب تک اپنی پیاس بجھاؤ گے

آؤ ہمارے پاس دکھائیں اشکوں کی برسات تمہیں
کب تک اڑتے بادل سے پانی کی آس لگاؤ گے

آج نہیں تو کل بدلے گا موسم خشک ہواؤں کا
رنگ محل کے رہنے والو کب تک خیر مناؤ گے

مجھ پر سب الزام دھریں گے، پاگل ہے، سودائی ہے
تم تو دل کے تار بجا کر دُور کھڑے مسکاؤ گے

دیکھو ان کچّی کلیوں کو مت مسلو ورنہ اک دن
سُوکھے پیڑ کی شاخ پہ بیٹھے تنہا اشک بہاؤ گے

وہ دن دُور نہیں جب ذرّے سورج بن کر چمکیں گے
منظرؔ اپنا دامن مت جھاڑو ورنہ پچھتاؤ گے

○

افق افق ہیں نمایاں سیاہیاں کیسی
کہ مل رہی ہیں فسانوں کو سُرخیاں کیسی

ہمارے گھر کا نشاں ڈھونڈنے نہ نکلی ہوں
سروں پہ کوند رہی ہیں یہ بجلیاں کیسی

جنھیں پیالہ و ساغر سمجھ کے چوما تھا
بھری ہیں آج ان آنکھوں میں بجلیاں کیسی

خطا ہوئی ہے تو ہیں لائقِ سزا ہم لوگ
بغیرِ جُرم یہ نامہربانیاں کیسی

ترے تغافلِ پیہم سے کیا خبر تجھ کو
اُجڑ کے رہ گئیں آباد بستیاں کیسی

ہمیں خبر ہے کہ فصلِ بہار آنے تک
ملیں گی اہلِ جنوں کو تسلّیاں کیسی

تمہارا گھر بھی ہے شاہد ہمارا آنگن بھی
چلی ہیں اب کے برس غم کی آندھیاں کیسی

سُنا ہے بابِ کرم کھُل گیا مگر اب تک
تہی ہیں تیرے فقیروں کی جھولیاں کیسی

ہمیں نے فرش نشینوں کو اوج بخشا ہے
ہمیں سے کرتے ہیں یہ سرگرانیاں کیسی

ہمیں نے راہ میں آنکھیں بچھائی تھیں کل تک
پنھا رہے ہو ہمیں آج بیڑیاں کیسی

جو اپنے وقت کے فرہاد تھے وہی منظرؔ
اُڑا رہے ہیں محبّت کی دھجّیاں کیسی

○

تمام عمر اگر خونِ آرزو کرتے
تو پھر گلوں سے تقاضائے رنگ و بو کرتے

ہمارے خوں سے نکھرتا جمالِ صبح تو ہم
تمام رات دل و جاں لہو لہو کرتے

دل و نگاہ پہ ہوتا جو اختیار تو ہم
تمام عمر اشاروں میں گفتگو کرتے

ہمارے رخ پہ ٹھہرتی نگاہِ یار تو ہم
بڑے ادب سے زمانے کو قبلہ رو کرتے

ملی نہ کوئے نگاراں میں گردشِ دوراں
زبانِ شعر میں ہم ورنہ گفتگو کرتے

حدیثِ دار ہی روحِ سخن نہیں منظرؔ
کبھی تو کاکل و عارض کی گفتگو کرتے

○

عجیب موسمِ گل ہے کہ ہر تبسم پر
لباسِ غنچہ و گُل تار تار ہوتا ہے

جو پتھروں کو سمجھتے ہیں زندگی کا لباس
انہی پہ رازِ جنوں آشکار ہوتا ہے

خیال و خواب کی رنگین داستانوں سے
کہیں علاجِ غمِ روزگار ہوتا ہے

○

پا بہ زنجیر اسیروں کو گھماتے رہنا
رونقِ کوچہ و بازار بڑھاتے رہنا

منزلِ عشق و ہوس ایک نہ ہونے پائے
دوستو راہ میں دیوار اُٹھاتے رہنا

بوالہوس اوڑھ کے نکلے ہیں ردائے عشاق
یہ نیا رُوپ بھی دنیا کو دکھاتے رہنا

رسمِ سقراط زمانے سے نہ اُٹھنے پائے
ساغرِ زیست میں کچھ زہر ملاتے رہنا

جب تلک شورِ شکستِ درِ زنداں اُٹھے
اپنے ہی پاؤں کی زنجیر ہلاتے رہنا

سُرخ رو دار سے پلٹیں گے رفیقانِ جنوں
کوئے جاناں کے در و بام سجاتے رہنا

لے اُڑیں دل کو نہ آوارہ خیالات کہیں
ان کو الفاظ کی زنجیر پنھاتے رہنا

تم پہ اس دور میں جو سنگ اُٹھائے اس کو
شیشۂ گردشِ حالات دکھاتے رہنا

کج کلاہوں کی بھنویں پھر نہ کہیں تن جائیں
ان کو آئینۂ تاریخ دکھاتے رہنا

گُل رخو وادئ گلپوش میں گاہے گاہے
یاد ہم دشت نشینوں کی مناتے رہنا

اپنی خود ساختہ جنّت سے نکل کر منظرؔ
ریگ زاروں میں بھی کچھ پھول کھلاتے رہنا

○

عرشِ دل پر کبھی آنکھوں پہ بٹھائیں آؤ
تم اگر رُوٹھ گئے ہو تو منائیں آؤ

دل نوازی کے وہ انداز نہیں ہیں نہ سہی
دوستی، رسم سمجھ کر ہی نبھائیں آؤ

دوستو رسمِ جنوں عام ہوئی جاتی ہے
بارشِ سنگ سے اِس گھر کو بچائیں آؤ

کیا ہی اچھا ہو جو ان خواب بھری آنکھوں سے
ہم بھی اک شب کے لئے نیند چُرائیں آؤ

بات تو جب ہے کہ اس تیز ہوا کی زد پر
شب زدو ہم بھی کوئی دیپ جلائیں آؤ

آ رہے ہیں بڑی سج دھج سے رفیقانِ جنوں
سُولیاں گاڑ کے رستوں کو سجائیں آؤ

پھُول سے رنگ تو غنچوں سے تبسّم لے کر
آئینہ زہرہ جمالوں کو دکھائیں آؤ

کب تلک مہر بہ لب پھرتے رہو گے یارو
کچھ تو رودادِ ستم ان کو سُنائیں آؤ

رنگ لائی ہیں اسیرانِ جنوں کی آہیں
تم کو پگھلی ہوئی زنجیر دکھائیں آؤ

اجنبی شہر میں کب تک پھریں تنہا منظرؔ
جو ملے اس سے رہ و رسم بڑھائیں آؤ

○

ہمارے قرب کے لمحے جو یاد آئیں اسے
قسم خدا کی بڑی دیر تک رُلائیں اسے

وہ پاس آئے تو ہم راہ پر لگائیں اسے
بٹھا کے سامنے پہروں غزل سُنائیں اسے

نسیمِ صبح کی صورت کبھی وہ گزرے تو
ہمیں قسم ہے جو ہم ہاتھ بھی لگائیں اسے

نہیں ہے گردشِ دوراں پہ اختیار مگر
خدا وہ وقت نہ لائے کہ بھول جائیں اسے

ہمیں زمانے کی بیگانگی سے کیا نسبت
وہ رُوٹھ جائے تو سو بار ہم منائیں اسے

وہ ایک پل بھی ٹھہرتا نہیں ہوا کی طرح
ہم اپنے پاس بھلا کس طرح بٹھائیں اسے

ابھی تو گردشِ دوراں ہماری راہ میں ہے
ابھی ہے وقت چلو چل کے آزمائیں اسے

مزہ تو جب ہے کہ وہ روبرو ہو اور منتظرؔ
کسی کی زُلف کے بل کھول کر دکھائیں اسے

○

موضوعِ فکر روح رہی یا بدن رہا
لیکن مری نظر میں تغزّل کا فن رہا

فصلِ بہار آئی تو مہکا دیارِ غیر
ویران کس خوشی میں ہمارا چمن رہا

حائل جنوں کی راہ میں دیوار کی طرح
شیخِ حرم رہا تو کبھی برہمن رہا

تنہا خرد سے طے نہ ہوا کوئی مرحلہ
ہر دَور میں جنوں ہی روایت شکن رہا

پھولوں کے سر بہاریں کٹتے رہے مگر
گلچیں کے اختیار میں نظمِ چمن رہا

پھیکی پڑیں نہ انجمنِ دل کی رونقیں
یزداں رہا یہاں تو کبھی اہرمن رہا

شیخِ حرم کی ہرزہ سرائی کے باوجود
مائل بتوں پہ برسوں دلِ برہمن رہا

○

جب سے ہم تیشہ زن بن گئے ہیں
کتنے صحرا چمن بن گئے ہیں

جن کی خاطر جیئے ہم وہی اب
دشمنِ جان و تن بن گئے ہیں

ملک در ملک تھے جن کے چرچے
آج ننگِ وطن بن گئے ہیں

○

چشمِ پُرآب روانی پہ روانی مانگے
دل کا یہ حال وہی سوزِ نہانی مانگے

میری خاموشیٔ پیہم بھی ہے دنیا پہ گراں
اور تو مجھ سے مری شعلہ بیانی مانگے

نغمہ و شعر کے لہجے میں اُسے سمجھاؤں
وہ اگر مجھ سے محبّت کی نشانی مانگے

جس کا ہر حلقہ مرے پاؤں کی زنجیر بنا
دل اسی گیسوئے برہم کی کہانی مانگے

وائے معبود کہ تو میرے گناہوں کا حساب
چھوڑ کے مجھ کو فرشتوں کی زبانی مانگے

دوستو، پیرویٔ غالبؔ و مومنؔ کب تک
عہدِ نو نت نئے الفاظ و معانی مانگے

میں حدیثِ دل و جاں لکھتا رہوں گا منظرؔ
خلقتِ شہر نہ جب تک مرا ثانی مانگے

○

رہا یہ حبس تو دم ہی نکل نہ جائے کہیں
حیات موت کے سانچے میں ڈھل نہ جائے کہیں

بہت دنوں سے ہے لاحق اُسے یہ اندیشہ
مریضِ جبر کی حالت سنبھل نہ جائے کہیں

مجھے یہ ڈر ہے کہ اِس سیلِ رنگ و نکہت میں
مزاجِ سبزہ و گُل ہی بدل نہ جائے کہیں

ضمیرِ حُسن کا سودا تو ہو چکا یارو
جنوں بھی وقت کے سانچے میں ڈھل نہ جائے کہیں

تلاشِ صورت و معنی کی دُھن میں ہم سخنو
مذاقِ شعر ہی یکسر بدل نہ جائے کہیں

قدم قدم پہ عقیدت تراشتی ہے صنم
محبتوں کا جنازہ نکل نہ جائے کہیں

رہا جو شہرِ نفس میں یونہی گھمس منظر
یہ جسم موم کی صورت پگھل نہ جائے کہیں

○

ایک میں تھا جس کے شانوں پر رہی غم کی صلیب
ورنہ کس کو عشق میں یہ مرتبہ حاصل ہوا

اپنی اپنی منزلوں اور راستوں کے باوجود
ہر کوئی اک دوسرے کے درمیاں حائل ہوا

روز اک فرمانِ تازہ، روز اک افتادِ نو
بزمِ خوباں کیا ہوئی، اک حلقۂ قاتل ہوا

○

کون کہتا ہے کہ احساسِ غمِ دوش نہیں
اپنی بربادیٔ پیہم کا کسے ہوش نہیں

عہدِ رفتہ کی تصاویر دکھانے والو
میں زمانے کی طرح زود فراموش نہیں

تم نے دیکھا تو بہت دُور سے دیکھا مجھ کو
مصلحت کیش ہوں میں وعدہ فراموش نہیں

منزلِ دار و رسن چھوڑ کے جانے والو
کوچۂ یار کی ہر شام سحر پوش نہیں

لب کشائی پہ جو مجبور کیا ہے تو سنو
ہم وفا کیش ہیں، احسان فراموش نہیں

ایک مدّت سے ہے بازارِ جنوں بھی ٹھنڈا
کوئے جاناں کے در و بام ہی خاموش نہیں

لاکھ بٹھلائے کوئی نطق و دہن پر پہرے
بولنے والے سرِ دار بھی خاموش نہیں

کچھ تو ہوں گے کہ تجھے یاد رکھیں گے منظرؔ
شہر کا شہر تو احسان فراموش نہیں

○

محبّت نے ایسے بھی منظر دکھائے
بُھلانے سے وہ اور بھی یاد آئے

یہ بے نور کرنیں، یہ سفّاک سائے
بڑی آرزو تھی نئی صبح آئے

○

قتل کرتے ہیں نہ جینے کی دُعا دیتے ہیں
لوگ کس جُرم کی آخر یہ سزا دیتے ہیں

سلسلہ شامِ ستم کا ہو کہ صبحِ غم کا
ہم ترے کاکل و عارض سے مِلا دیتے ہیں

ذوقِ ہنگامہ اُبھرتا ہے تو اہلِ زنداں
اپنے ہی پاؤں کی زنجیر ہلا دیتے ہیں

دوستو ظلم کی شب تیز ہوا کے جھونکے
آمدِ صبحِ تمنّا کا پتا دیتے ہیں

جب بھی ہم چاہتے ہیں ان سے وفاؤں کا صلہ
سر پہ لٹکی ہوئی تلوار دکھا دیتے ہیں

منزلِ دار سے ہنس ہنس کے گزرنے والے
عظمتِ گیسو و رخسار بڑھا دیتے ہیں

ڈھال کر پیکرِ اشعار میں ہم رُوحِ حیات
کتنے پردے رُخِ دوراں سے اُٹھا دیتے ہیں

کوئی آواز پلٹ کر نہیں آتی منظر
کب سے بیٹھے درِ جاناں پہ صدا دیتے ہیں

○

زندگی کو کیا مِلے گا زُلف و رُخ کی بات سے
آپ خود بھی سوچئے ہٹ کر ذرا جذبات سے
خوشبوئے گُل کو دبا سکتی نہیں بادِ خزاں
صبح کی توقیر بڑھتی ہے اندھیری رات سے
اک تبسم سے ہماری داستانِ غم کی داد
یہ توقع تو نہ تھی ہرگز تمہاری ذات سے
تیرا غم برحق مگر اے عندلیبِ نغمہ سنج
آگ لگ جائے نہ گلشن میں ترے نغمات سے

○

کس کو خبر نہیں کہ ہیں شعلۂ حُسنِ یار ہم
پہلے بھی بے قرار تھے اب بھی ہیں بے قرار ہم

منزلِ غم کے ہمسفر جانے چلے گئے کدھر
سونی پڑی ہے رہگزر بیٹھے ہیں سوگوار ہم

بارشِ سنگ بھی ہوئی دعوتِ دار بھی ملی
کوچۂ یار سے مگر گذرے ہیں بار بار ہم

کوئی نہیں جو دُکھ بھرے دل کی زباں سمجھ سکے
پھرتے ہیں دربدر لئے کاسۂ روزگار ہم

ترکِ تعلقات کا سہل نہیں ہے فیصلہ
آپ ہمارے پردہ دار آپ کے پردہ دار ہم

موسمِ گُل گذر گیا تب یہ ہمیں پتہ چلا
اپنی ہی جیب و آستیں کرتے تھے تار تار ہم

○

چوٹ پر چوٹ دل نے کھائی ہے
زندگی کس کو راس آئی ہے

بِن تمہارے خزاں نہ بن جائے
سن رہا ہوں بہار آئی ہے

بارہا آرزو میں ہنسنے کی
ہم نے اپنی ہنسی اُڑائی ہے

کتنے پھولوں کو روند کر منظرؔ
گلستاں میں بہار آئی ہے

اِس طرح کبھی راندۂ دربار نہیں تھے
رسوا تھے مگر یوں سرِ بازار نہیں تھے

صحرا میں لئے پھرتی ہے دیوانگیٔ شوق
کیا شہر میں تیرے در و دیوار نہیں تھے

ہے جرأتِ گفتار تو پھر سامنے آ کر
کہہ دیجئے ہم لوگ وفادار نہیں تھے

کیوں ہم ہی کھٹکتے رہے دنیا کی نظر میں
دیوانوں میں اک ہم ہی طرحدار نہیں تھے

دیتے ہیں دعائیں تری دزدیدہ نظر کو
دیوانے کبھی اتنے تو ہشیار نہیں تھے

کیوں مہر بہ لب کوچۂ جاناں سے گزرتے
انسان تھے ہم سایۂ دیوار نہیں تھے

وارفتگیٔ شوق بتا تو ہی کہ ہم سے
آباد کبھی کوچہ و بازار نہیں تھے

○

زندگی کل بھی رہی شیخ و برہمن کی اسیر
آج بھی کشمکشِ دیر و حرم باقی ہے

یہ بھی کیا کم ہے کہ اِس دَورِ ہوس میں متظر
کچھ نہ کچھ عظمتِ اربابِ قلم باقی ہے

○

ہزاروں گردشیں ہوں غم نہیں ہے
ہمارا جام، جامِ جم نہیں ہے

ہوئی رخصت جنوں کی فصل پھر بھی
نگاہ و دل کی وحشت کم نہیں ہے

وہی ہے اشتیاقِ دیدہ و دل
تمہاری زلف ہی میں خم نہیں ہے

تمہاری راہ میں بھی گردشیں ہیں
ہمیں کو زندگی کا غم نہیں ہے

زمانے کی روش بھی ان دنوں کچھ
تری بیگانگی سے کم نہیں ہے

تری رُسوائیوں سے ڈر رہا ہوں
مجھے اپنا تو کوئی غم نہیں ہے

زمانے کا چلن مت سیکھ منظرؔ
زمانہ آشنائے غم نہیں ہے

○

یہ رنگِ میکدہ ہے تو اک روز میکشو
ہوگا ضرور حشر بپا جانتے ہیں ہم

ہم نے بھی زندگی میں اُٹھائے ہیں دُکھ بہت
اظہارِ مدّعا کی سزا جانتے ہیں ہم

تیری فسردگی کا بھی سوچیں گے کچھ علاج
اپنے تو ہر مرض کی دوا جانتے ہیں ہم

○

چھیڑتے ہیں وہ یوں ذکرِ دار و رسن جیسے ہم ان کی باتوں سے ڈر جائیں گے
یا گلستاں میں اب کے بہار آئے گی یا رگ و پے میں نشتر اُتر جائیں گے

سوچتا ہوں درِ حُسن پر رات دن یونہی پہرے رہیں گے تو اے جانِ من
اپنی پلکوں پہ اشکوں کی سوغات لے کر یہ دیوانے تیرے کدھر جائیں گے

کتنے ہی سخت ہوں زیست کے مرحلے، لاکھ پُر پیچ ہوں پیار کے راستے
تو اگر ہم سفر ہے تو پھر ہم ہر اک راہ سے ہو کے سینہ سپر جائیں گے

ڈر رہا ہوں کہ اِس دَور کے کھنکھناتے ہوئے سونے چاندی کے بازار میں
اک نہ اک دن ترا پیار بِک جائے گا، میرے رنگین جذبات مر جائیں گے

لاکھ ڈالے کوئی پاؤں میں بیڑیاں لاکھ گاڑے کوئی راہ میں سُولیاں
جو تری رہگزر سے گزر آئے ہیں وہ ہر اک رہگزر سے گزر جائیں گے

کوئی غنچہ تو چٹکے سرِ گلستاں، سیرِ گُل کو تو نکلا کریں گُل رُخاں
یہ زمیں تو زمیں ہے تہہِ آسماں زندگی کے فسانے بکھر جائیں گے

کھول کر آج دروازۂ جان و دل، اطلسی پیرہن کی ہوا بخش دے
ورنہ زنداں کے اِس گرم ماحول میں تیرے دیوانے گُھٹ گُھٹ کے مر جائیں گے

نازِ صد کجکلاھی اُٹھائیں گے ہم تجھ سے عہدِ محبّت نبھائیں گے ہم
اپنے دامن میں کانٹے بھرے ہوں مگر تیری آغوش پھولوں سے بھر جائیں گے

جتنے شکوے گلے ہیں مٹا لو ابھی جو سُنانا ہے منظرؔ سُنا لو ابھی
ورنہ ان مہ وشوں کا بھروسہ ہی کیا آج وعدہ کیا کل مُکر جائیں گے

○

اور ہوں گے کہ جنھیں موسمِ گل راس آیا
ہم تو اس زلف کی مانند پریشاں ہی رہے

○

حسنِ شیشہ گر سلامت، آئنہ خانے بہت
دار کے قصے، لب و عارض کے افسانے بہت

دیکھ کر تیرہ رُخِ محراب اے شیخِ حرم
یاد آتے تو کبھی ہوں گے صنم خانے بہت

چھین لیں تجھ سے نہ تیرا حسن اے جانِ بہار
زندگی سے اب کے ہیں بے زار دیوانے بہت

آپ اپنا گھر بچائیں وقت کے سیلاب سے
ہم فقیروں کے لئے دنیا میں کاشانے بہت

آپ کی زُلفوں کا خم دیکھیں کہ اپنی اُلجھنیں
ہیں اِسی چکّر میں صبح و شام دیوانے بہت

ہر طرف شورِ سلاسل، ہر طرف ذکرِ صلیب
منظران شہروں سے تو اچھے ہیں ویرانے بہت

○

ہم نے کچھ دیکھا نہیں طوق و سلاسل کے سوا
لوگ کہتے ہیں تری زُلف کے خم اچھے ہیں

خدشۂ راہزنی اور نہ اندیشۂ سنگ
شیش محلوں سے تو مٹّی کے حرم اچھے ہیں

آپ کی ذات سے وابستہ ہیں جذبات ان کے
آپ اچھے ہیں تو اربابِ قلم اچھے ہیں

کاش دیکھیں وہ کبھی ڈوبتے دل کا منظر
جن کے نزدیک ترے لُطف و کرم اچھے ہیں

○

ہم خانماں خراب ہوئے بھی تو غم نہیں
سیلِ بلا سے آپ کا گھر تو بچا لیا

آزاد ہو کے آج ہر اک قید و بند سے
یاروں نے زندگی کو تماشہ بنا لیا

جب سے جُدا ہوئے ہیں ترے قافلے سے ہم
دنیا نے اپنی راہ کا پتّھر بنا لیا

کل شب جو میرے دوش پہ بکھری کسی کی زُلف
سائے نے روشنی کو گلے سے لگا لیا

پرکھا اُسے تو دوستو کنکر کے مول تھا
موتی سمجھ کے پیار سے جس کو اُٹھا لیا

فصلِ بہار میری تب و تاب لے اُڑی
موجِ نسیم نے ترا لہجہ — چُرا لیا

منظرؔ جہاں میں اور کوئی کام کیجئے
فنکار بن کے آپ نے کیا فیض پا لیا

○

رنگِ چمن اُڑا اُڑا، چہرۂ گُل بُجھا بُجھا
اب کے یونہی گذر گیا، قافلۂ بہار کیا

شہرِ غزال چھوڑ کر پھرتے ہیں ہم نگر نگر
اور کرے گی دربدر گردشِ روزگار کیا

کارِ جہاں سے بے خبر، رکھتے ہو حُسن پر نظر
منظرِ سادہ دل مگر حُسن کا اعتبار کیا

○

وفا کا شہر ہے ہر شخص غمگسار سا ہے
اب آبھی جاؤ کہ ماحول سازگار سا ہے

وفا کا چاند نہ اُبھرے گا ان فضاؤں میں
جہاں دلوں کے اُفق پر ابھی غبار سا ہے

ابھی تو صبح کی پہلی کرن نہیں پھُوٹی
ابھی تو ہجر کے ماروں کو انتظار سا ہے

کبھی ارادۂ گلگشت ہو تو دھیان رہے
کھِلا ہوا مرے سینہ میں لالہ زار سا ہے

فضائے کوچہ و بازار ہی نہیں چُپ چُپ
تمام شہر ترے غم میں سوگوار سا ہے

○

افتادِ غزالانِ چمن دیکھ رہا ہوں
رستا ہوا پھولوں کا بدن دیکھ رہا ہوں

ٹوٹے نہ قیامت کوئی پھر غنچہ و گُل پر
کجلائی ہوئی صبحِ چمن دیکھ رہا ہوں

تاریک ہے ماحول مگر میں سرِ آفاق
خوش رنگ اُجالوں کی کرن دیکھ رہا ہوں

ہے بابِ قفس بند مگر روزنِ در سے
جلتی ہوئی دیوارِ چمن دیکھ رہا ہوں

اک عمر ہوئی ترکِ مراسم کو مگر میں
اب تک ترے ماتھے پہ شکن دیکھ رہا ہوں

○

تیرے دیوانوں پہ جب وقت کڑا ہوتا ہے
دھوپ ہوتی ہے مگر سایہ جُدا ہوتا ہے

اس بھرے شہر میں ہر شخص ہے سودائی ترا
ایک دیوانے کو سمجھانے سے کیا ہوتا ہے

اور کچھ دیر رُکو، آخرِ شب کے لمحو
زندگی بھر کے لئے کوئی جُدا ہوتا ہے

جب بھی زندانوں سے آتی ہے سلاسل کی صدا
ایک ہنگامہ پسِ دار بپا ہوتا ہے

تیرے آنچل کی مہک ہو کہ ہوائے گُل ہو
دیدہ و دل کا ہر اک زخم ہرا ہوتا ہے

قابلِ جُرم ہے اس دور میں چُپ رہنا بھی
اور کچھ کہئے زباں سے تو گلا ہوتا ہے

لاکھ بہلائے کوئی ذہن پہ پہرے منظر
زخم کھِلتا ہے تو مجبورِ نوا ہوتا ہے

○

کیا سوچ کے ہم لوگ ترے شہر میں آئے
وحشی کوئی سمجھے کوئی دیوانہ بتائے

جس روز سے سمٹے ہیں تری زُلف کے سائے
اس گردشِ دوراں نے بڑے رنگ دکھائے

دعویٰ ہے جسے معرکۂ دار و رسن کا
وہ پہلے تری زُلف کو سر کر کے دکھائے

○

نکلی جو کڑی دھوپ تو محسوس ہوا ہے
کس درجہ خنک چاند ستاروں کی ضیا ہے

آ اے غمِ جاناں، تجھے سینے سے لگائیں
اِس گردشِ دوراں نے بڑا خون پیا ہے

وہ سنگ اُٹھائیں کہ سرِ دار بلائیں
دیوانے ہیں ہم، ہم پہ ہر اک ظلم روا ہے

جذبات سے ہٹ کر کوئی سوچے تو یقیناً
آواز مری سارے زمانے کی صدا ہے

رسوائی کا ڈر ہے تو سرِ بزم نہ آئیں
کہنا ہے وہی، ہم نے جو محسوس کیا ہے

مغموم اُمنگوں کو کلیجے سے لگائے
اس دَور میں ہر شخص دوراہے پہ کھڑا ہے

مہکا ہے کبھی زخم تو چمکا ہے کبھی داغ
اس عہد میں کیا خوب وفاؤں کا صلہ ہے

○

کس جگہ پہرہ نہ تھا، کس موڑ پر بندش نہ تھی
آنے والے تیرے کوچے میں مگر آتے رہے

بن سکا مرہم نہ کوئی زخمِ دل کے واسطے
صرف صورت دیکھنے کو چارہ گر آتے رہے

کس نے تیرے شہر میں پائی ہے اپنے فن کی داد
ہم سے پہلے سینکڑوں اہلِ ہنر آتے رہے

○

اب اس کو رسم و رہِ کوچۂ بتاں کہیے
جو مہرباں نہیں اس کو بھی مہرباں کہیے

وفا کی داد نہیں چاہیے مگر کب تک
کسی کے جبرِ مسلسل کو امتحاں کہیے

کہاں تلک نہ رقم کیجیے حوادثِ دہر
کہاں تلک لب و گیسو کی داستاں کہیے

حدیثِ دار و رسن، داستانِ روح و بدن
ترے حضور نہ کہیے تو پھر کہاں کہیے

غبارِ خاطرِ یاراں کے ہم نہیں قائل
ہے کوئی بات تو پھر سب کے درمیاں کہیے

ہر ایک بزم میں نظریں اُسی کو ڈھونڈھتی ہیں
وہ ایک شخص جسے جانِ دلبراں کہیے

○

خشک پتّہ بھی اگر راہ میں کھڑکا ہوگا
قافلے والوں پہ کیا سانحہ گزرا ہوگا

تجھ سے آمادۂ پیکار ہے اُس نے شاید
ایک ہی رُخ تری تصویر کا دیکھا ہوگا

حرف آجائے گا اربابِ جنوں پر ناحق
لوگ سمجھیں نہ مری بات تو اچھّا ہوگا

بے سبب تیز نہیں دھڑکنیں دل کی منظر
بے نیازانہ کوئی پاس سے گذرا ہوگا

○

ہر شہر میں چرچے ہیں اُسی جانِ غزل کے
جو سامنے آیا نہ کبھی گھر سے نکل کے

اے زلفِ غزالاں ہمیں مایوس نہ کرنا
آئے ہیں ترے سائے میں ہم دُور سے چل کے

پھرتے ہیں ترے شہر کی گلیوں میں پریشاں
چرچے تھے کبھی جن کی زبانوں پہ محل کے

جن ہاتھوں پہ الزام لگا سنگ زنی کا
وہ ہاتھ ہی معمار ہیں ہر شیش محل کے

اک عمر ہوئی قطعِ مدارات کو لیکن
محسوس یہ ہوتا ہے کہ افسانے ہیں کل کے

مقصود ہے اس جانِ تمنّا کی ستائش
یہ چاند ستارے تو اشارے ہیں غزل کے

○

ملا ہے حکم کہ ہر بات برملا نہ کہو
وہ بے وفا ہے مگر اس کو بے وفا نہ کہو

تمہارے شہر کی گلیاں ہمیں سے ہیں آباد
ہمیں حقیر نہ سمجھو، ہمیں گدا نہ کہو

یہ کیسی شرطِ گدائی ہے تیرے کوچے میں
صدا لگاؤ مگر دل کا مدّعا نہ کہو

○

تری نظر سے محبت ٹپک رہی ہے آج
بہار پردۂ گل سے جھلک رہی ہے آج

سُنا ہے گھر سے وہ نکلے ہیں سیرِ گل کے لئے
کلی کلی مرے دل کی چٹک رہی ہے آج

جو دب گئی تھی کبھی تیری لے سے اے مطرب
وہ آگ سینۂ گُل میں بھڑک رہی ہے آج

جنونِ شوق کے آثار ہو رہے ہیں عیاں
نقاب، چہرۂ گُل سے سرک رہی ہے آج

بہت قریب ہے شاید حدودِ مہر و نجوم
زمین، چہرۂ آدم کو تک رہی ہے آج

مجھے خبر ہے کہ منظر نگاہِ یزداں میں
ادائے حضرتِ آدم کھٹک رہی ہے آج

○

ہماری راہ تو فکر و نظر سے روشن تھی
یہ کیا ہوا کہ اندھیروں میں کھو گئے ہم بھی

نگارِ وقت کبھی ہم کو یاد کر لینا
کہ اپنے خوں سے ترے داغ دھو گئے ہم بھی

بڑھیں جو حد سے تری بے حجابیاں کل شب
تو فرطِ شوق میں بے باک ہو گئے ہم بھی

○

ان گنت چاند سی صورتیں تھیں مگر
خوں اُگلتی رہی دل کی ہر رہگزر

آنے والے زمانے سے ہیں بے خبر
یہ شفق تاب چہرے یہ آباد گھر

چھوڑ کر سایۂ زلف کی رہگزر
تپتے صحرا میں ہم کر رہے ہیں سفر

جانے چمکے گی کب قسمتِ بام و در
مدّتوں سے نہیں روشنی کا گزر

تختِ یزداں پہ ڈالیں کمندِ نظر
کوئی تجھ سا حسیں ہو اگر راہبر

سیرِ شب کو نہ نکلا کرو مہ وشو
پڑ نہ جائے کسی بوالہوس کی نظر

ذہن میں یوں کوئی جال بُنتا رہا
جیسے تالاب میں چاندنی کا سفر

زندگی آج اس موڑ پر ہے جہاں
اپنی پرچھائیوں سے بھی لگتا ہے ڈر

لے کے نکلو کبھی پیار کی مشعلیں
دل کہ برسوں سے ہے ایک تیرہ کھنڈر

○

اس بزم سے بہتر ہے کہ تنہا ہی رہیں ہم
جس بزم میں اپنی کوئی آواز نہیں ہے

○

یہ رات، یہ زنداں کی فضا یاد رہے گی
بُجھتے ہوئے تاروں کی ضیا یاد رہے گی

جب تک مرے احساس کا ہر زخم ہرا ہے
ظالم ترے آنچل کی ہوا یاد رہے گی

یوں قافلۂ موسمِ گُل گذرا ہے اب کے
غنچوں کے چٹکنے کی صدا یاد رہے گی

اے فصلِ بہاراں کے حسیں نغمہ سراؤ
کیا تم کو مری چاک قبا یاد رہے گی

اظہارِ حقیقت ہے اگر جُرم تو یارو
تا عمر ہمیں اپنی خطا یاد رہے گی

ہم بُھول بھی جائیں گے مگر دل کو ہمیشہ
کج فہمیٔ اربابِ وفا یاد رہے گی

گُل ریز ہیں ماضی کے سویرے تو یقیناً
ان پُھول سے ہاتھوں کی حنا یاد رہے گی

○

مسکراہٹ گلوں کو راس نہیں
اب بہاروں سے کوئی آس نہیں
میں ہوں اور شامِ غم کی تنہائی
دُور تک کوئی آس پاس نہیں
ان مہکتی ہوئی بہاروں میں
کون سا گُل ہے جو اُداس نہیں

○

سخت تھا زیست کا سفر تنہا
تیرا غم چھوڑتا اگر تنہا

کاسۂ عشق لے کے ہاتھوں میں
ہم پھرے ہیں نگر نگر تنہا

داغِ حسرت چھپائے سینے میں
عشق پھرتا ہے در بدر تنہا

کھو گئے قافلے امیدوں کے
رہ گئی دل کی رہگزر تنہا

پھول، نغمے، بہار، نظّارے
سب ہیں موجود ہم مگر تنہا

○

گیتوں پہ مردنی ہے نغمے سسک رہے ہیں
کس موڑ پر کھڑے ہم دنیا کو تک رہے ہیں

گہرائیوں میں دل کی وہ جھانک کر تو دیکھیں
ہیں کتنے زخمِ دل جو اب تک مہک رہے ہیں

ہر صاحبِ نظر ہے مشعل بدست پھر بھی
کچھ لوگ راہِ غم میں تنہا بھٹک رہے ہیں

ہم رہروانِ غم کی بد قسمتی تو دیکھو
راہیں تو کاٹ دی ہیں منزل پہ تھک رہے ہیں

ہو جائے گُل نہ منظر اک دن چراغِ لالہ
کب سے تہِ بہاراں شعلے بھڑک رہے ہیں

○

چھوڑ کر سایۂ کوچۂ گُل رُخاں
اِس کڑی دھوپ میں آگئے ہم کہاں

آکے دیکھو کبھی دل کی دہلیز پر
سر پٹکتی ہیں رہ رہ کے تنہائیاں

جو بھی کہنا ہے کُھل کے کہو دوستو
کب تلک چُپکے چُپکے یہ سرگوشیاں

وقت نے لاکھ پہرے بٹھائے مگر
ہم سُناتے رہے دُکھ بھری داستاں

گُل نہ کر دیں کہیں شمعِ احساس کو
تیری آنکھوں کی یہ ادھ کُھلی کھڑکیاں

جن زمینوں پہ پہنچے ہیں تیرے قدم
اُگ رہی ہے وہاں اک نئی کہکشاں

گرم ہر شے کا بازار ہے ان دنوں
ٹھپ پڑی ہے مگر شاعری کی دکاں

○

کب سے ہے منتظرِ ہم نفساں
اجنبی راہگزاروں میں کوئی

دیر سے ڈھونڈھ رہا ہے خود کو
تیرہ و تار دیاروں میں کوئی

بھول کر چشمکِ دوراں منظر
کھو گیا ان کے اشاروں میں کوئی

○

حلقۂ انسانیت سے بھی نکل جاتے ہیں وہ
اجنبی راہوں میں آتے ہی بدل جاتے ہیں وہ

جرم نکلی دشتِ غم میں آبلہ پائی مری
اب یہ عالم ہے کہ بچ بچ کر نکل جاتے ہیں وہ

فصلِ گُل آتے ہی معیارِ حقیقت مٹ گیا
کاغذی پھولوں کو پاکر بھی بہل جاتے ہیں وہ

بن گئی ہے مصلحت کوشی زمانے کا اصول
میں نے دیکھا ہے کہ پل بھر میں بدل جاتے ہیں وہ

ذہن ماضی کے فسانوں میں کچھ اتنا غرق ہے
بات مستقبل کی چھڑ جائے تو جل جاتے ہیں وہ

نقشِ پا کی جستجو ہے، اب نہ رہبر کی تلاش
اک نئی منزل کی جانب آج کل جاتے ہیں وہ

○

ہونٹوں پہ تبسّم بھی ہے ماتھے پہ شکن بھی
کیا خوب ہے اس شہر کے لوگوں کا چلن بھی

اے راہروِ منزلِ نو دیکھ کے چلنا
سُنتے ہیں کہ اس راہ میں ہیں دار و رسن بھی

صیّاد سے کیا شکوۂ دزدیدہ نگاہی
ہے دید کے قابل کرمِ اہلِ چمن بھی

غمہائے زمانہ سے اگر مل گئی فرصت
باقی نہ رہے گی تری زلفوں کی شکن بھی

○

سرفراز آپ کا نام کر جائیں گے
کوچۂ عشق میں لے کے سر جائیں گے

ہو اجازت تو ہم بھی صبا کی طرح
تیرے آنچل کو چھو کر گزر جائیں گے

آپ ہونٹوں کے ٹانکے اُدھڑنے تو دیں
خود فضاؤں میں نغمے بکھر جائیں گے

دوستو جب وہ شامِ الم ڈھل گئی
زندگی کے یہ دن بھی گزر جائیں گے

سُن رہے ہیں کہ گلشن میں اب کے برس
غنچہ و گُل کے سب زخم بھر جائیں گے

جب تلک آپ ہوں گے وفا آشنا
ہم پہ کتنے ہی عالم گزر جائیں گے

تھرتھرائے گی جب تک ستاروں کی لو
کتنے مہتاب دل میں اُتر جائیں گے

رنگ لائے گی جب تک دلوں کی خلش
ہم مقامِ خلش سے گزر جائیں گے

اس میں اپنے لہو کا زیاں ہی سہی
ہم چراغوں کی لو تیز کر جائیں گے

مشعلِ یادِ یاراں فروزاں کئے
راہِ غربت سے منظر گزر جائیں گے

○

رندوں سے نہ کر انکار کہ ساقی رات گزرنے والی ہے
اک جامِ سحر آثار کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

انوارِ سحر کے دامن میں تمہیدِ شکستِ جام بھی ہے
محفل کو بنا سرشار کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

ہم آج کی شب ناکام سہی، ہاتھوں میں شکستہ جام سہی
ہاں تو بھی مگر ہشیار کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

احساس یہ ہے اب تک بھاری غمہائے زمانہ کی تلخی
اک جامِ مئے گلنار کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

ماحول کے سہمے چہرے پر کرنوں کا تبسّم دیکھ لیا
کہتے ہیں در و دیوار کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

میخانۂ ہستی میں یہ کیوں نیند آنے لگی ہے رندوں کو
لا بادۂ شب بیدار کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

پینے کے لئے ہم کل شب تک معلوم نہیں زندہ بھی رہیں
ہے عمر سبک رفتار کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

ہر چشمِ خمار آلودہ سے، ہر ٹوٹے ہوئے پیمانے سے
آتی ہے یہی جھنکار کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

محفل کی اُداسی کا منظر ہے سب کی نگاہوں کا مرکز
اک تو ہی نہیں ہشیار کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

○

زمانہ ہمیں غور سے دیکھتا ہے
ہم اک دوسرے کی نظر دیکھتے ہیں

○

مرحلے زیست کے دشوار نہیں دیوانو
ماورائے رسن و دار نہیں دیوانو

کیا کرو گے دلِ پُرخوں کی حکایت سُن کر
یہ حدیثِ لب و رخسار نہیں دیوانو

خاکۂ ذہن پہ اُبھرے تو کوئی نقشِ جمیل
بند دروازۂ افکار نہیں دیوانو

کیا کرو گے مہ و انجم پہ جما کر نظریں
مہرِ گیتی ہی ضیا بار نہیں دیوانو

پُرسشِ حال میں احساسِ تکلّف کیسا
کوئی سایۂ پسِ دیوار نہیں دیوانو

کتنی حسرت سے ہمیں دیکھ رہی ہے دنیا
ہم میں خود جرأتِ گفتار نہیں دیوانو

کوئی روشن تو کرے شمعِ شبستانِ خیال
منجمد چشمۂ افکار نہیں دیوانو

○

کتنی آرزوؤں کے آفتاب ڈھلتے ہیں
تب کہیں نکھرتا ہے حسن ماہ پاروں کا

پھر گلوں کے سینے کے زخم ہوگئے تازہ
چاک پھر ہوا شاید پیرہن بہاروں کا

○
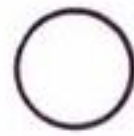
نوحہ گرانِ عظمتِ انساں رہے ہیں ہم
دنیا سمجھ رہی ہے غزل خواں رہے ہیں ہم

صبحِ چمن کے نغمہ سراؤں کو کیا خبر
پروردگارِ فصلِ بہاراں رہے ہیں ہم

اے دوست التفاتِ مسیحا کے باوجود
برسوں حریفِ گردشِ دوراں رہے ہیں ہم

ہم آشنائے فطرتِ گل ہیں کہ مدّتوں
پروردۂ بہارِ گلستاں رہے ہیں ہم

خوبانِ شب کی سازشِ پیہم کے باوجود
پیغمبرانِ صبحِ درخشاں رہے ہیں ہم

وہ دَور بھی تو بارہا آیا ہے دوستو
جب اپنے سائے سے بھی گریزاں رہے ہیں ہم

چٹکی ہے جب بھی دل کے شبستاں میں چاندنی
پہروں کسی کے غم میں پریشاں رہے ہیں ہم

○

رات بھر چراغوں کی ہم نے لَو بڑھائی ہے
تب کہیں امیّدوں کی صبح جھلملائی ہے

میرے خواب زاروں میں تم ہو اور دنیا بھی
ورنہ زندگی تنہا کس کو راس آئی ہے

تیرے شہر میں جس سے گفتگو ہوئی اس نے
اپنے ہی دُکھے دل کی داستاں سُنائی ہے

○
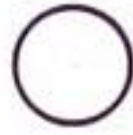
لوگ کس لئے آخر بے رُخی سے مِلتے ہیں
کوئی ہم سے مِلتا ہے، ہم کسی سے مِلتے ہیں

کشتۂ غمِ دوراں کب کسی سے مِلتے ہیں
آپ ہی تک آتے ہیں آپ ہی سے مِلتے ہیں

اُن سے گفتگو کرتے عمر ہو گئی لیکن
جب کبھی وہ مِلتے ہیں، اجنبی سے مِلتے ہیں

چاکِ جیب و داماں پر طنز ہر نظر میں ہے
ہم سے وہ بظاہر تو سادگی سے مِلتے ہیں

سائۂ سلاسل ہو، دار ہو کہ زنداں ہو
زندگی کے دیوانے، زندگی سے مِلتے ہیں

رہروانِ راہِ نو نا امید مت ہونا
سلسلے اندھیروں کے روشنی سے ملتے ہیں

سوچیئے تو اے منظر دردِ زیست کے رشتے
کچھ نہ کچھ عنایاتِ خسروی سے ملتے ہیں

○

آگے بڑھنے کو بڑھے منزل بہ منزل ہم مگر
یہ نہیں سوچا کبھی آخر کہاں تک آ گئے

رنگ لا کر ہی رہی رندانِ تشنہ لب کی پیاس
ہاتھ بڑھ کر دامنِ پیرِ مغاں تک آ گئے

کیا خبر کتنے خداؤں کا بھرم کھل جائے گا
دل کے افسانے اگر میری زباں تک آ گئے

○

دردِ ہجراں کی حکایت سُن کر
چاک دامانِ طلب یاد آیا

دل کے داغوں پہ بہار آتے ہی
دامنِ صبحِ طرب یاد آیا

ہاتھ بڑھنے بھی نہ پائے ساقی
وعدۂ ترکِ طلب یاد آیا

بات جب دار و رسن تک پہنچی
حلقۂ گیسو و لب یاد آیا

خامشی دیکھ کے محفل میں تری
منظرِ نغمہ بہ لب یاد آیا

○

ان کے روبرو آکر دل کہیں سنبھلتا ہے
کہہ رہے ہیں کچھ لیکن مُنہ سے کچھ نکلتا ہے

شامِ غم کی تاریکی بے سبب نہیں یارو
سو چراغ بُجھ کر ہی اک چراغ جلتا ہے

فصلِ گُل تو آئی ہے فصلِ گُل میں بھی یارو
کوئی پھول چُنتا ہے، کوئی ہاتھ ملتا ہے

زندگی کی راہوں میں سائے کی طرح ہر دم
تم نہیں تو پھر میرے ساتھ کون چلتا ہے

اے نسیم کے جھونکو، گُل کہیں نہ کر دینا
یہ جو میری پلکوں پر اک دیا سا جلتا ہے

○

فصلِ گُل بھی آتی ہے، جام بھی کھنکتے ہیں
اپنی آرزوؤں کے باغ کب مہکتے ہیں

جھلملانے لگتی ہیں تیری یاد کی راہیں
جب کبھی خیالوں کے قافلے بھٹکتے ہیں

کتنے لالہ و گل کا سینہ چاک ہوتا ہے
تب کہیں بہاروں کے پیرہن مہکتے ہیں

باغ دیدہ و دل کا خشک ہو گیا لیکن
پھول تیری یادوں کے آج بھی مہکتے ہیں

کون چھُو کے گزرا ہے سرحدِ تخیّل کو
کس کی نکہتِ پا سے بام و در مہکتے ہیں

کس کا عکس پڑتا ہے شیشۂ دل وجاں پر
کس کی یاد کے شعلے ذہن پر لپکتے ہیں

منتظر اس خموشی کا کچھ تو ہے سبب آخر
کون سے تصوّر میں ذہن و دل بھٹکتے ہیں

○

جو دُور رہ کے ہمیں بے قرار رکھتے ہیں
خدا کرے کہ انھیں بھی قرار آجائے

کبھی کبھی تو وہ اس طرح سامنے آئے
سنور کے جیسے عروسِ بہار آجائے

○

یہی ہیں کیا مری اگلی محبتوں کے صِلے
کہ ایک بار جو بچھڑے تو پھر کبھی نہ مِلے

ذرا سی دیر کا مِل بیٹھنا غنیمت ہے
کسے خبر ہے کہ یہ وقت پھر مِلے نہ مِلے

کسی کا نقش کچھ اس طرح ذہن پر اُبھرا
کہ جیسے دامنِ صحرا میں کوئی پھول کِھلے

وہی جو مدتوں سائے کی طرح ساتھ رہے
تمہاری بزم میں پہنچے تو اجنبی سے مِلے

بھرے چمن میں نہیں کوئی آشنائے بہار
نسیمِ صبح کے جھونکوں کی داد کس سے ملے

○

حوصلے عشق کے دیدار سے آگے نہ بڑھے
ہم حدیثِ لب و رخسار سے آگے نہ بڑھے

لاکھ ہونٹوں پہ رہا گردشِ دوراں کا گلہ
اہلِ فن مسلکِ گفتار سے آگے نہ بڑھے

مرحلے اور بھی تھے منزلِ دشوار کے بعد
راہرو منزلِ دشوار سے آگے نہ بڑھے

ہم نے جس شوق سے راہوں کو کیا تھا ہموار
ہم اسی جذبۂ سرشار سے آگے نہ بڑھے

صرف پہنچے تو ہمیں دار و رسن تک منظر
لوگ ذکرِ رسن و دار سے آگے نہ بڑھے

○

بُجھ گئی شاخِ آشیاں یارو
گلستاں ہے دھواں دھواں یارو

حوصلے تھے ابھی جواں یارو
رُک گیا قافلہ کہاں یارو

سخت سے سخت مرحلوں میں بھی
ہم کو رہنا ہے نغمہ خواں یارو

دل کو جس طرح چاہو، سمجھا لو
کون ہوتا ہے مہرباں یارو

محفلوں کے چراغ گُل نہ ہوئے
ہو چکی ختم داستاں یارو

اجنبیّت ہے اس نگر کا چلن
ہائے ہم آ گئے کہاں یارو

اور کچھ دُور میرے ساتھ چلو
جانے پھر ہم مِلیں کہاں یارو

○

نذر ہوئی ہیں کتنی کلیاں
تجھ کو خبر ہے صبحِ بہاراں؟

چیخ رہے ہیں اہلِ زنداں
زندہ باد اے نظمِ گلستاں

○

ہزار خونِ دلِ عندلیب ہوتا ہے
تو پھر گلوں کو تبسّم نصیب ہوتا ہے

جو دُور رہ کے بھی تجھ سے قریب ہوتا ہے
حقیقتاً وہ بڑا خوش نصیب ہوتا ہے

تبسّمِ گل و غنچہ بھری بہاروں میں
کسے خبر کہ خزاں کا نقیب ہوتا ہے

جنوں جہاں سے گزرتا ہے بے نیازانہ
وہیں کہیں پہ دیارِ حبیب ہوتا ہے

ابھی ہے ترکِ تعلّق ابھی ہے عہدِ وفا
یہ حُسن و عشق کا رشتہ عجیب ہوتا ہے

گلوں کے سینے کے خود زخم بھر نے لگتے ہیں
جہاں بہار کا موسم قریب ہوتا ہے

○

یہ شامِ قفس، یہ دار و رسن، معلوم نہیں کیا ہونا ہے
لائی ہے کہاں تک دل کی لگن معلوم نہیں کیا ہونا ہے

گذرے ہوئے لمحوں کی یادیں، احساس کو اب تک ڈستی ہیں
ہے تیز بہت دل کی دھڑکن معلوم نہیں کیا ہونا ہے

بے مہریِ عالم کے ہاتھوں دیکھی ہے شکستِ شیشۂ دل
اشکوں سے ہے اب تک تر دامن معلوم نہیں کیا ہونا ہے

اظہارِ خلوصِ پیہم کی تکلیف بھی ناحق کرتے ہو
ڈوبا ہے لہو میں پیراہن معلوم نہیں کیا ہونا ہے

○

رہِ حیات میں جو غم کو غم سمجھتے ہیں
وہ لوگ زیست کا مفہوم کم سمجھتے ہیں

لہو پلا کے ترے حُسن کو نکھارا ہے
بہارِ نو! تری قیمت تو ہم سمجھتے ہیں

تم ان لبوں کے تبسم سے مطمئن ہی سہی
گزر رہی ہے جو ہم پر وہ ہم سمجھتے ہیں

وہ جن کے دستِ کرم میں ہے نظمِ میخانہ
وہ تشنہ لب کے اشاروں کو کم سمجھتے ہیں

یہی یقین بہت ہے شکستہ حالوں کو
ہماری بات تو وہ کم سے کم سمجھتے ہیں

کہاں کہاں انھیں دیکھا نہیں گیا منظر
ہمیں تقدّسِ اہلِ حرم سمجھتے ہیں

○

ہم نے جن یاروں سے کھائے ہیں بہر گام فریب
ہم نے اکثر انہی یاروں سے محبّت کی ہے

جو دمِ عرضِ وفا تھے سرِ مژگاں موجود
اُن دمکتے ہوئے تاروں سے محبّت کی ہے

تم مرے ساتھ میں گزرے ہو جہاں سے اکثر
میں نے ان راہگزاروں سے محبّت کی ہے

جن کے سائے میں گزاری شبِ پیمانِ وفا
میں نے اُن چاند ستاروں سے محبّت کی ہے

○

آج تک نہ سِل پایا جن کا چاکِ دامن بھی
ان گلوں سے قائم ہے آبروئے گلشن بھی

رہروانِ منزل کی بات کون سُنتا ہے
اپنی اپنی کہتے ہیں، راہبر بھی، رہزن بھی

زندگی بھٹکتی ہے مصلحت کی راہوں پر
کس قدر غنیمت تھا میرا چاکِ دامن بھی

دیکھو اب کسی سے بھی دل کی بات مت کہنا
قافلے میں اے یارو، دوست بھی ہیں دشمن بھی

بے نیاز گزرا ہوں راہِ دیر و کعبہ سے
آج مجھ سے برہم ہے شیخ بھی برہمن بھی

مجھ کو عصرِ حاضر کا ترجمان بننا ہے
میرے ذہن میں منظر زندگی بھی ہے، فن بھی

○

نہ مسکرا مرے حالِ تباہ پر اے دوست
خزاں نہ ہو تو وقارِ بہار کچھ بھی نہیں

تمہی نے میری نظر کو بدل دیا ورنہ
حقیقتاً تو مجھے ناگوار کچھ بھی نہیں

تری جفا کو دعائیں ترے ستم کی خیر
کہ اب جہاں میں مجھے ناگوار کچھ بھی نہیں

کوئی بہار بداماں کوئی اسیرِ قفس
خطا معاف، یہ نظمِ بہار کچھ بھی نہیں

○

سیلِ آلام میں بھی زمزمہ خواں گزرے گی
دل جواں ہے تو ہر اک رات جواں گزرے گی

ہم نہ کہتے تھے کہ اک روز یہی صبحِ بہار
مسکراتے ہوئے غنچوں پہ گراں گزرے گی

کس کو معلوم تھا خود حُسن کی بے تاب نظر
ایک دن عشق کی جانب نگراں گزرے گی

ہم کو معلوم نہیں تھا کہ ہماری ہر بات
آپ کے حُسنِ سماعت پہ گراں گزرے گی

کچھ خبر بھی ہے اگر اُٹھ گئے ہم سے میخوار
تیرے میخانے پہ کیا پیرِ مغاں گزرے گی

ایک وہ منزلِ بے نامِ وفا بھی ہے جہاں
دل دھڑکنے کی بھی آواز گراں گزرے گی

آپ بھی حضرتِ منظرؔ مرے ہمراہ چلیں
آج کی رات سرِ کوئے بتاں گزرے گی

○

چند ہی شاخوں پہ گلشن میں دھواں کب تک رہے
برق کے رحم و کرم پر آشیاں کب تک رہے
جس کو خاموشی پہ یوں مجبور فرماتے ہیں آپ
وہ زباں رکھتے ہوئے بھی بے زباں کب تک رہے
سینۂ گل خونچکاں دیکھا ہو جس نے خود اسے
خندۂ گل پر بہاروں کا گماں کب تک رہے
ہیں مداوائے غمِ دل کے لئے قصے بہت
حرفِ زلف و رخ کی لب پر داستاں کب تک رہے

یہ تو بجا کہ ہم رہیں چشمِ کرم سے دُور دُور
خود بھی نہ رہ سکے مگر آپ جو ہم سے دُور دُور

دیر و حرم کی نفرتیں، لوٹ چکیں نشاطِ زیست
راہروانِ راہِ نو، دیر و حرم سے دُور دُور

اہلِ جہاں سے کیا ہمیں، صرف ملال اس کا ہے
آپ بھی ہم سے بدگماں، آپ بھی ہم سے دُور دُور

میرا مذاقِ بندگی توڑ چکا روایتیں
آج جبیں ہے آپ کے نقشِ قدم سے دُور دُور

میکدۂ جہاں میں ہے ایک ہجومِ میکشاں
جامِ سفال کے قریب، ساغرِ جم سے دُور دُور

دل میں خیالِ منزلِ دار و رسن لئے ہوئے
آج کوئی گزر گیا، کوئے صنم سے دُور دُور

منظرِ سادہ دل جنھیں دوست سمجھ رہے تھے ہم
آج وہی وفا سرشت ہوگئے ہم سے دُور دُور

○

غوّاصِ محبّت کی اللہ رے خوش انجامی
گردابِ حوادث میں ساحل نظر آتا ہے

امواجِ تلاطم میں اک ڈوبنے والے کو
تنکے کا سہارا بھی ساحل نظر آتا ہے

○

دامنِ شامِ خزاں، سایہ فگن آج بھی ہے
غنچہ و گل پہ گراں، صبحِ چمن آج بھی ہے

ہم خزاں ہی کو اداسی کا سبب سمجھے تھے
پھیکا پھیکا سا مگر رنگِ چمن آج بھی ہے

جن کے سائے میں کٹی تھیں مری راتیں اکثر
ان دمکتی ہوئی زلفوں میں شکن آج بھی ہے

اجنبی بن کے اُڑاتے ہیں محبّت کا مذاق
یہ ترے شہر کے لوگوں کا چلن آج بھی ہے

کوئی آمادۂ تعمیرِ گلستاں بھی تو ہو
غنچہ و گل کا لہو نذرِ چمن آج بھی ہے

کل بھی لگتی تھیں صداقت کے لبوں پر مہریں
حق پرستوں کے لئے دار و رسن آج بھی ہے

باوجودِ نگہِ لطف و کرم اے منظر
ان کے ماتھے پہ اُبھرتی سی شکن آج بھی ہے

○

آکاش پہ بکھرے ہوئے تاروں سے مجھے کیا
اس بزم میں میرا مہِ کامل تو نہیں ہے

جلتے ہوئے پروانوں کی جانب بھی تو دیکھو
اک شمع ہی بس رونقِ محفل تو نہیں ہے

احساس بھی رنگین ہے ماحول بھی رنگیں
تو میری نگاہوں کے مقابل تو نہیں ہے

○

کبھی قفس کے کبھی ہم چمن کے ساتھ رہے
جہاں کہیں بھی رہے بانکپن کے ساتھ رہے

دل و نگاہ کو اب تک نہیں یقین کہ ہم
تمام رات تری انجمن کے ساتھ رہے

ہماری جرأتِ گفتار چھیننے ـــــــ والو
لہو کے داغ اگر پیرہن کے ساتھ رہے

مرا مزاقِ طلب بھی عجیب ہے ساقی
شرابِ نو بھی شرابِ کہن کے ساتھ رہے

بھٹک رہے ہیں منازل کے پیچ و خم میں ہنوز
جو لوگ زلفِ شکن در شکن کے ساتھ رہے

○

کھلنے دیا نہ ہم نے غمِ دوست کا بھرم
ہنس ہنس کے زندگی کو گزارے چلے گئے

تھی راہِ عشق سخت مگر اے غمِ حبیب
اکثر ترے سہارے سہارے چلے گئے

اکثر بساطِ عشق پہ ہم ان کے روبرو
بازی کو جان جان کے ہارے چلے گئے

لائی تھی عرضِ غم کی تمنّا ہمیں مگر
پاکر تری نظر کے اشارے چلے گئے

منظرؔ گلہ کریں بھی کسی سے تو کیا کریں
دو دن کی زندگی تھی گزارے چلے گئے

○

رہِ ہستی میں فکرِ جان و تن سے کچھ نہیں ہو گا
مجھے ڈر ہے کہ اب اہلِ چمن سے کچھ نہیں ہو گا

شکستِ بابِ زنداں کے لئے جرأت بھی لازم ہے
فقط اندیشۂ دار و رسن سے کچھ نہیں ہو گا

اگر ہم کو مزاجِ گردشِ دوراں بدلنا ہے
تو اس پابندیٔ رسمِ کہن سے کچھ نہیں ہو گا

غمِ دوراں سے دیوانوں کو فرصت ہی نہیں ساقی
تری زلفِ شکن اندر شکن سے کچھ نہیں ہو گا

بنامِ عظمتِ انساں ہم اک جنّت بنائیں گے
اب اس تفریقِ شیخ و برہمن سے کچھ نہیں ہو گا

ہزاروں زخم باقی ہیں ابھی پھولوں کے سینے میں
فقط آرائشِ صحنِ چمن سے کچھ نہیں ہو گا

ہم اپنی خانہ ویرانی پہ منظرؔ خود ہی رو لیں گے
کہ اس سے بڑھ کے اور یادِ وطن سے کچھ نہیں ہو گا

○

کچھ صرفِ خزاں ہو جاتے ہیں کچھ نذرِ بہاراں ہوتے ہیں
گُل ایک تبسّم کی خاطر سو بار پریشاں ہوتے ہیں

وہ میری پریشاں حالی پر کیوں اتنے پریشاں ہوتے ہیں
غم جن کو اپنا لیتا ہے بیگانۂ درماں ہوتے ہیں

مر کر بھی نہیں جاتے دیکھیں جینے کی تمنّائیں دل سے
کتنے دلکش انداز ترے اے عمرِ گریزاں ہوتے ہیں

کیوں کر بہلے دل اے منظرؔ اُس جانِ تمنّا سے چُھٹ کر
پھُولوں کی طرح یہ تارے بھی کچھ دیر کے مہماں ہوتے ہیں

○

انقلابات کچھ ایسے بھی نظر سے گزرے
صبح کے بعد بھی ظلمت تھی جدھر سے گزرے

ایک جلوہ بھی ترا جس کی نظر سے گزرے
کیوں نہ وہ بچ کے رہِ شمس و قمر سے گزرے

منزلِ دار بھی ہے کوچۂ محبوب بھی ہے
دیکھنا یہ ہے کہ اب کون کدھر سے گزرے

سایۂ عارض و گیسو میں بسر کر کے حیات
ہم بھی اک سلسلۂ شام و سحر سے گزرے

اجنبیّت کا ترے شہر میں احساس ہوا
ہم پہ ہنستے ہوئے جب لوگ نظر سے گزرے

جس کو آرائشِ منزل کی طلب ہو اے دوست
بھول کر بھی نہ تری راہگزر سے گزرے

سو تلاطم ہیں ہر اک موجِ غمِ ہستی میں
دیکھئے کیا ہو، یہ طوفان جو سر سے گزرے

مدتیں بیت گئیں جس کی طلب میں منظرؔ
وہ سحر بھی تو کبھی اپنی نظر سے گزرے

○

مایۂ ناز مجھے وضعِ شکیبائی ہے
لب پہ فریاد نہ آئے، نہ کبھی آئی ہے

پھول ہی صرف نہیں میرے لئے وجہ حیات
مجھ پہ کانٹوں کا بھی احسانِ مسیحائی ہے

اس کو ہر لمحہ نیا رُوپ بدلتے دیکھا
صبحِ محشر ہے کہ یا رب شبِ تنہائی ہے

○

مائل بہ کرم گردشِ حالات ہوئی ہے
پھر ان سے سرِ راہ ملاقات ہوئی ہے

رُخ پر ترے گیسو جو پریشان ہوئے ہیں
نکلا ہے کبھی دن تو کبھی رات ہوئی ہے

یہ آپ کے ہونٹوں کا تبسّم تو نہیں تھا
ماحول پہ پھر بارشِ نغمات ہوئی ہے

ہر موڑ پہ رہزن ہیں ہر اک راہ میں کانٹے
قسمت سے مسافر کو کہاں رات ہوئی ہے

افسانۂ غم سُن کے وہ نادم ہیں جفا پر
جس بات سے ڈرتا تھا وہی بات ہوئی ہے

ایسا بھی کئی بار ہوا ہے شبِ غم میں
تم پاس نہ تھے اور ملاقات ہوئی ہے

کہنے کو نہ تھے آنکھوں میں دو اشک بھی منظر
رونے پہ جب اُترے ہیں تو برسات ہوئی ہے

○

اُس نظر سے نظر نہیں مِلتی
مِل چکی ہے مگر نہیں مِلتی

آئینہ گر تو آئینہ گر ہے
آئینے سے نظر نہیں مِلتی

ظلمتوں میں بھی نُور مِلتا ہے
شامِ غم کی سحر نہیں مِلتی

یہ شمس و قمر، یہ لالہ و گل، یہ ماہ، یہ انجم کچھ بھی نہیں
میں کانٹوں پہ ایماں لایا ہوں، پھولوں کا تبسم کچھ بھی نہیں

آج آپ کے لطفِ پیہم سے اظہارِ تصنّع ہوتا ہے
میں جذبِ دروں کا قائل ہوں، نظروں کا تصادم کچھ بھی نہیں

خاموش لبوں پر بھی اکثر، افسانے بکھرے ہوتے ہیں
اظہارِ وفا کرنے کے لئے تخصیصِ تکلّم، کچھ بھی نہیں

وہ جن کو طلب ہے ساحل کی منجدھار کو ساحل کہتے ہیں
طوفان شکن جذبوں کے لئے موجوں کا تلاطم کچھ بھی نہیں

اے پیرِ مغاں کب بدلے گی تنظیم ترے میخانے کی
یہ جام بہت بوسیدہ ہیں، یہ ٹوٹے ہوئے خم کچھ بھی نہیں

جو اپنی زمیں کے جلووں سے مدہوشِ تجلّی ہو جائیں
ان اہلِ نظر کی آنکھوں میں حسنِ مہ و انجم کچھ بھی نہیں

بیتابیٔ دل کو منظرؔ نے دنیا سے چھپایا ہے لیکن
اک کوششِ ضبطِ غم کے سوا ہونٹوں کا تبسّم کچھ بھی نہیں

○

ہوش و حواس کیوں نہ لٹا دوں بہار میں
فصلِ بہار آئی بڑے انتظار میں

بے چینیوں میں دل کو جو لذّت نصیب ہے
حاصل بھلا کہاں وہ سکون و قرار میں

منظرؔ تو اپنی آپ خطائیں گنا انھیں
شاید گناہ اُن سے نہ آئیں شمار میں

○

نہ کسی نگاہ نے لوٹ لی نہ کسی نگار نے چھین لی
مری زندگی کی ہر اک خوشی ترے اعتبار نے چھین لی

رہِ زندگی میں لٹا چکا میں شگفتگیِ دل و نظر
جو بچی بھی تھی غمِ دوست سے، غمِ روزگار نے چھین لی

نہ وہ آرزو، نہ وہ زمزمے، نہ وہ میکشی، نہ وہ محفلیں
یہ اُسی حیات کا ذکر ہے جو خیالِ یار نے چھین لی

مری زندگی کے تمام دن ترے اجتناب میں کٹ گئے
مری زندگی کی ہر ایک شب ترے انتظار نے چھین لی

میں چمن میں ایک بھی گل کے لب پہ ہنسی کا نام نہ پا سکا
مجھے آج اس کا یقین ہے یہ ہنسی بہار نے چھین لی

مجھے اپنی جرأتِ عرضِ غم پہ نہ جانے کتنا غرور تھا
مگر آج وہ بھی کسی کے دیدۂ اشکبار نے چھین لی

○

اُٹھائیں آپ نہ زحمت مرے ستانے کی
کہ ہیں نصیب مجھے گردشیں زمانے کی

خطا معاف، یہ میرے گمان میں بھی نہ تھا
کریں گے آپ بھی کوشش مرے مٹانے کی

ہزار بار جفاؤں کے ساتھ کھیلا ہوں
مری نگاہ میں ہیں سختیاں زمانے کی

اسیرِ دام، ملالِ ستم سے کیا حاصل
نظر میں کھینچ لے تصویر آشیانے کی

○

جو رنگِ حسن چشمِ حقیقت نگر میں ہے
اس جیسا پھول ہیں ہے نہ شمس و قمر میں ہے

یہ آج کون پردۂ گلہائے تر میں ہے
کچھ اور ہی بہارِ تماشہ نظر میں ہے

آجاؤ دو گھڑی کے لئے بے نقاب تم
بیمارِ شامِ ہجر، خیالِ سحر میں ہے

ہم جن کو ڈھونڈتے ہیں وہ آتے نہیں نظر
ہونے کو یوں تو ساری خدائی نظر میں ہے

ارمانِ التفاتِ مسیحا نہیں مجھے
اب لطفِ زندگی ہے، تو دردِ جگر میں ہے

○

مرا نصیب، نہ آئے اگر قرار مجھے
نگاہ بھر کے وہ دیکھیں تو ایک بار مجھے

خطا معاف کہ پروردۂ بہار ہوں میں
تمام نظمِ چمن پر ہے اختیار مجھے

بہائیں غیر بھی آنسو مری تباہی پر
غمِ حبیب نہ کر اتنا بے قرار مجھے

تم اپنے وعدۂ فردا پہ شرمسار نہ ہو
بہت عزیز ہے تکلیفِ انتظار مجھے

قفس پہ خونِ تمنّا چھڑک لیا میں نے
کہ لوگ سمجھیں تو آسودۂ بہار مجھے

منظر ایوبی کی غزلوں میں روایتی مضامین نہیں ہیں۔ ان میں لب و لہجہ وہی ہے جو غزل کو غزل بناتا ہے لیکن اس میں ان تمام تجربوں کا شعور ہے جو بیسویں صدی کے نصف آخر کے حساس شاعروں، ادیبوں، فنکاروں کا مشترک سرمایہ ہے۔ اس میں استعارے پرانے ہیں معنی نئے ہیں۔ یہ معنویت اس اذیت اور کرب کا نتیجہ ہے جس سے ہم قیامِ پاکستان سے قبل اور قیامِ پاکستان کے بعد گذرے ہیں۔

(ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

منظر ایوبی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن روایتی شاعر نہیں۔ ان کی غزل میں روایت بولتی ہے لیکن روحِ عصر کے ساتھ اور اسی لئے ان کے اشعار میں ایسا اثر ہے، جو لہجے کی گھلاوٹ میں چبھن اور تلخی کے ساتھ، ہمارے دل میں اُتر جاتا ہے۔ یہ تلخی، جو خوابوں کے بکھرنے سے پیدا ہوئی ہے، ہمیں ڈھاتی نہیں ہے بلکہ صلیب و دار پر پرچمِ عشق بلند کرنے اور ظلم، جبر، ناانصافیوں کے خلاف آواز اُٹھانے کا حوصلہ دیتی ہے منظر کی شاعری میں وہ تاریخی شعور ہے جو ہمیں جگاتا ہے۔ ان کی شاعری پڑھتے ہوئے ہمیں 'روشنی' کا احساس ہوتا ہے۔ ایسی روشنی جو ظلمت میں نور کاڑھتی ہے منظر ایوبی غزل کے شاعر ضرور ہیں لیکن ان کا احساس، ان کا رویّہ انقلابی ہے اور یہی وہ بات ہے جو جدید اُردو غزل میں انھیں ممتاز کرتی ہے۔

(ڈاکٹر جمیل جالبی)

منظر ایوبی عصرِ حاضر کے ایسے جواں فکر شاعر ہیں جنھوں نے حالات اور مسائل کا بے خوفی اور دیدہ وری کے ساتھ جائزہ لیا ہے وہ اپنے دَور کے تقاضوں اور فنی مطالبات دونوں سے آگاہ ہیں۔ اسی لئے ان کے کلام میں بے رنگی، بے سمتی اور بے راہ روی نہیں ہے۔ ان کے یہاں ذہانت، طباعی اور اسی کے ساتھ بیان کی شگفتگی اور تیزی ملتی ہے۔ ان کے کلام کا مطالعہ اس زمانے کے پیچیدہ مسائل کا مطالعہ ہے، جو سُلجھا ہوا اور فکر انگیز ہے۔

(مجتبیٰ حسین)

جدید غزل زمین پر رینگتی اور عصرِ حاضر کی پُر از کشمکش زندگی کے روز مرہ کے مسئلوں کی ترجمانی کرتی ہے۔ منظر ایوبی فکرِ جدید کے اسی مکتبِ تغزّل کے ممتاز نمائندے ہیں۔ ان کا کلام تصادم خیز زندگی کی زہرناکی سے مسموم ہے۔

(رئیس امروہوی)

منظر ایوبی اپنی شعر گوئی میں ذاتی غور و فکر سے کام لیتے ہیں اور بات سے بات پیدا کرنے میں مہارت اور پختگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ ان کی غزلوں کا مترنم لب و لہجہ ان کی خاص خصوصیت ہے انھوں نے اپنے زمانے کے سیاسی و معاشرتی حالات سے اثر قبول کیا ہے اور ان کو اپنی شاعری میں مناسب حد تک جگہ دی ہے۔

(سلیم احمد)

منظر ایوبی منفرد لب و لہجہ کا شاعر ہے۔ اس کی شاعری روایتی نہیں ہے۔ اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ ہمارے جدید ادب کا وقیع حصہ ہے اور مستقبل کا کوئی مورخ اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس کی شاعری جذبے کی صداقت اور فکر کی آفاقیت کی آئینہ دار ہے۔

(مشفق خواجہ)

منظر کی غزل جدید فکر و فن کے حوالے سے اپنا ایک ایسا چہرہ بناتی ہے جس میں کلاسکی رچاؤ کے ساتھ نئے عہد کے مسائل کی رنگا رنگی بھی ہے۔ وہ اپنے مشاہدے کی خارجی حقیقتوں کو غزل میں اس طرح سموتے ہیں کہ اس کے مزاج کی داخلیت کہیں سے مجروح نہیں ہونے پاتی یہی خصوصیت عصری تقاضوں سے ان کے قلم کا رشتہ استوار کرتی ہے۔ ان کے لہجے کی صداقت اور طرزِ اظہار کے نئے پن نے انھیں معیار کی اس سطح پر رکھا ہے جو ایک سچّے اور مقبول شاعر کی شناخت کا پیمانہ ہے۔

(شاعر لکھنوی)

منظر ایوبی روایت کے تقاضوں سے بخوبی واقف ہیں اور موجودہ عہد کی بصیرت کے لئے جذبۂ احترام رکھتے ہیں۔ وہ عصرِ نو کے فکری تقاضوں اور فنی التزامات کی پاسداری کرتے ہیں۔ روایت اور درایت کے لئے یکساں تپاک کا مظاہرہ جس قدر آسان نظر آتا ہے اسی قدر مشکل بھی ہے خیر یہ بات کچھ کم اہم نہیں ہے کہ وہ شاعری کے منصب اور اس کی اہمیت کے قائل ہیں۔

(محمد علی صدیقی)